بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

غالب نے جب کہا تھا کہ

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

تو اس نے ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ کسی کی موت پر پہلے آنسو تو وہ ہوتے ہیں جو ہنگامی طور پر بے اختیار نکل پڑتے ہیں لیکن اس کے بعد' اسکی یاد میں آنسو وہی بہاتا ہے جو اس کی کمی محسوس کرتا ہے۔ جتنی شدید اس کی کمی ہو۔ اتنی ہی گہری اس کی یاد ہوتی ہے اور جس جس مقام پر اسکی کمی نمایاں ہوتی ہے اسی مقام پر آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔

نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ ہوا' علامہ اقبال ہم سے رخصت ہو گئے اور ہنگامی طور پر ساری قوم کی آنکھیں بایں نمط اشکبار ہوئی تھیں کہ دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ ایسا ماتم شاید ہی کسی اور کی موت پر ہوا ہوگا۔ ایسا ہونا بھی چاہئے تھا۔ اقبال ملت کا دھڑکنے والا دل تھا۔ اس کے رک جانے سے قوم کی نبضِ ہستی ساکت ہو جانی چاہئے تھی۔ لیکن اس کے بعد قوم کے آنسو خشک ہونے لگ گئے اور اب ان کی آنکھیں اس طرح بے نم ہو گئی ہیں کہ کسی کو خیال تک بھی نہیں گذرتا کہ انہی آنکھوں سے کبھی خون کے آنسو ٹپکے تھے۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے کہ قوم کو اس کا احساس ہی نہیں کہ

''غالبِ خستہ'' کے بغیر کون (کون) سے کام بند ہیں۔

جن قوموں میں زندگی کا صحیح نظام قائم ہو' ان میں افراد کی موت سے کوئی کام بند نہیں ہوتا۔ افراد آتے ہیں اور افراد جاتے ہیں لیکن وہ نظام اپنے زورِ دروں سے بدستور آگے بڑھے چلا جاتا ہے لیکن جن قوموں میں نظامِ زندگی مفقود ہو ان میں کسی زندہ (یعنی صحیح معنوں میں زندہ اور زندگی بخش) فرد کی موت۔۔۔۔ اور ایسے وقت میں موت جب کہ اس کا مشن ابھی ناتمام ہو۔۔۔۔ بہت بڑا سانحہ ہوتا ہے۔ ایسی اقوام میں دیدہ ور افراد پیدا ہی بڑی مشکل سے ہوتے ہیں اور اگر کوئی ایسا فرد اپنے پیشِ نظر مقصد کی تکمیل سے پہلے مر جائے تو یہ اس قوم کی انتہائی بدقسمتی ہوتی ہے۔ لیکن اس بدقسمتی کا احساس تو اسے ہی ہو سکتا ہے جو یہ سمجھے کہ

''غالبِ خستہ'' کے بغیر کون (کون) سے کام بند ہیں

ہماری قوم نے اقبال کو ایک شاعر سمجھا اور یہ ظاہر ہے کہ شاعر کے بغیر قوم کا کوئی کام رکا نہیں رہتا۔ اس لئے اگر اقبال کی یاد میں قوم کے دل سے ہوک نہیں اٹھتی تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس میں قصور قوم کا نہیں۔ قصور ان کا ہے جنہوں نے قوم کو بتایا ہی نہیں کہ اقبال کیا تھا اور کیا کرنا چاہتا تھا۔

علامہ اقبال نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس (منعقدہ ۱۹۳۲ء) کے صدارتی خطبہ میں کہا تھا کہ:

''جو قومیں فکر سے عاری ہو جاتی ہیں۔ تباہ ہو جاتی ہیں۔''

اقبال کے بعد، قوم فکر سے محروم ہو گئی اور یہ قوم کا اتنا بڑا نقصان تھا جس کی تلافی نہیں ہو سکی۔ اقبال کی فکر نے قوم کو پاکستان کا تصور دیا۔ یہ اتنی بڑی نعمت تھی جس کی مثال ہماری تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ لیکن جب پاکستان حاصل ہوا تو قوم اس فکر سے محروم ہو چکی تھی۔ اس فکر کی محرومی سے قوم کی حالت کیا ہوئی ہے، اس کا اندازہ وہی آنکھیں لگا سکتی ہیں جنہیں خدا نے بینائی عطا کی ہے اور وہ اصحابِ بصیرت جو یہ جانتے ہیں کہ اقبال نے پاکستان کا تصور کس مقصد کے لئے دیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا ابوالکلام آزاد

(مولانا) ابوالکلام آزاد کا نظریۂ حدیث

اثباتِ کذب کے لئے ایک غلط توجیہہ

''اب غور کرو۔ اس تمام سرگزشت میں کونسی بات ایسی ہے جس سے حضرت ابراہیم کا جھوٹ بولنا نکلتا ہو؟ بتوں کو انہوں نے کچھ چوری چھپے نہیں توڑا تھا کہ خلاف واقعہ بات کہہ کے اسے چھپانا چاہتے۔ تمام پجاریوں کے سامنے صاف صاف اعلان کر دیا تھا' اور اعلان بھی اس تاکید کے ساتھ کہ ''تاللہ لا کیدن اصنامکم'' خدا کی قسم! میں ضرور تمہارے بتوں کو اپنے داؤ کا نشانہ بناؤں گا۔ پھر جو بات اس طرح صاف صاف کہہ دی گئی ہو' اور علانیہ کی گئی ہو' اس میں جھوٹ بولنے کی بات کہاں سے نکل آئی؟ باقی رہا ان کا یہ کہنا کہ بل فعلہ کبیرھم ھذا تو ظاہر ہے کہ ایک لمحہ کے لئے اس سے مقصود انکار فعل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ فعل کا تو وہ پہلے سے اعلان کر چکے تھے اور خود پوچھنے والوں میں ایک ایک فرد جانتا تھا کہ انہی کا کیا دھرا ہے۔ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ محض حجت الزامی تھی۔ اور حجت الزامی کا وہ طریقہ جسے ہمارے مناظر ''فرض الباطل مع الخصم حتی تلزمہ الحجتہ'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ صدق و کذب کا سوال یہاں کیونکر پیدا ہوسکتا ہے۔

چونکہ ہمارے مفسروں کے سامنے ایک روایت موجود تھی' اور اس کی تعمیل میں ضروری سمجھتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح جھوٹ کی بات بن جائے' اس لئے انہوں نے کوشش کی کہ جو بات قرآن میں نہیں ہے' وہ محذوف بنا کر بڑھا دی جائے۔ چنانچہ وہ حضرت ابراہیم کے قول تاللہ لاکیدن اصنامکم کو سلسلۂ بیان سے الگ کر لیتے ہیں' اور کہتے ہیں' یہ بات انہوں نے مخاطبوں سے نہیں کہی تھی۔ اپنے جی میں کہی تھی۔ یعنی ان کا اعلان نہ تھا۔ جی ہی جی میں ایک سازش سوچی تھی۔ لیکن یہ محض رائے سے قرآن کے مطالب میں اضافہ کرنا ہے۔ قرآن میں یہ کہیں نہیں ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے جی میں کہا تھا۔ وہ تو صاف صاف کہہ رہا ہے کہ موقعہ مخاطبہ اور مکالمہ کا تھا اور جب پجاریوں نے یہ بات کہی کہ اجئتنا بالحق ام انت من اللاعبین؟ تو اس کے جواب میں حضرت ابراہیم نے اعلان کیا۔ علاوہ بریں اس طرح کے محذوفات جبھی تسلیم کئے جا سکتے ہیں جبکہ کوئی قطعی قرینہ موجود ہو۔

یہاں بجز اس ضرورت کے کہ حضرت ابراہیم کو کذب گو بنایا جائے' اور کونسی ضرورت لاحق ہوگئی ہے کہ یہ محذوف گھڑ لیا گیا؟

باقی رہی صحیحین کی روایت کہ لم یکذب ابراہیم فی شئی قط الا ثلاث کلھن فی اللہ۔ الخ۔ تو اگرچہ اس کی توجیہہ وتاویل کی بہت سی راہیں لوگوں نے کھول لی ہیں' مگر صاف بات وہی ہے جو امام ابوحنیفہ کی طرف منسوب ہے اور جسے امام رازی نے بھی دہرایا ہے۔ **یعنی ہمارے لئے یہ تسلیم کر لینا نہایت آسان ہے کہ ایک غیر معصوم راوی سے فہم وتعبیر حدیث میں غلطی ہو گئی' بہ مقابلہ اس کے کہ ایک معصوم اور برگزیدہ پیغمبر کو جھوٹا تسلیم کر لیں! اگر ایک راوی کی جگہ سینکڑوں راویوں کی روایت بھی ناقص ٹھہر جائے' تو بہرحال غیر معصوم انسانوں کی غلطی ہوگی۔ لیکن اگر ایک معصوم پیغمبر کو بھی غلط بیان تسلیم کر لیا گیا' تو نبوت ووحی کی ساری عمارت درہم برہم ہوگئی!**

بلاشبہ روایت صحیحین کی ہے' لیکن اس تیرہ سو برس کے اندر کسی مسلمان نے بھی راویانِ حدیث کی عصمت کا دعویٰ نہیں کیا ہے' نہ امام بخاری ومسلم کو معصوم تسلیم کیا ہے۔ کسی روایت کے لئے بڑی سے بڑی بات جو کہی گئی ہے' وہ اس کی ''صحت'' ہے۔ ''عصمت'' نہیں ہے اور ''صحت'' سے مقصود صحت مصطلحہ فن ہے۔ نہ کہ صحتِ قطعی ویقینی مثل صحتِ قرآن۔ پس ایک روایت پر صحت کی کتنی ہی مہریں لگ چکی ہوں' لیکن بہرحال غیر معصوم انسانوں کی ایک شہادت اور غیر معصوم ناقدوں کا ایک فیصلہ ہے۔ ایسا فیصلہ ہر بات کے لیے مفید حجت ہوسکتا ہے' مگر یقینیات وقطعیات کے خلاف نہیں ہوسکتا۔ جب کبھی ایسا ہوگا کہ کسی راوی کی شہادت یقینیات قطعیہ سے معارض ہو جائے گی' تو یقینیات اپنی جگہ سے نہیں ہٹیں گے۔ غیر معصوم کو اپنی جگہ چھوڑنی پڑے گی۔

نبی کا سب سے بڑا وصف جو قرآن نے بتلایا ہے' وہ اس کی سچائی ہے' اور احتیاج تفصیل نہیں۔ نبوت ایک سیرت ہے جو صرف سچائی ہی سے بنتی ہے' اور صرف سچائی ہی کے سانچے میں ڈھل سکتی ہے۔ ایک نبی کسی بات سے عاجز نہیں ہوتا' مگر اس بات سے کہ سچ نہ بولے۔ حقیقت اور سچائی کے خلاف جو کچھ ہے' خواہ کسی شکل اور کسی درجہ میں ہو' نبوت کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا۔ اگر نبوت ہوگی تو سچائی بھی ہوگی۔ اگر سچائی نہیں ہے تو نبوت بھی نہیں۔ پس انبیاء کرام کی سچائی اور عصمت یقینیاتِ دینیہ ونقلیہ میں سے ہے۔ روایات کی قسموں میں سے کتنی ہی بہتر قسم کی کوئی روایت ہو' بہرحال ایک غیر معصوم راوی کی شہادت سے زیادہ نہیں' اور غیر معصوم کی شہادت ایک لمحہ کے لئے بھی یقینیات دینیہ کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ ہمیں مان لینا پڑے گا کہ یہ اللہ کے رسول کا قول نہیں ہوسکتا۔ یقیناً یہاں راویوں سے غلطی ہوئی ہے اور ایسا مان لینے سے نہ تو آسمان پھٹ پڑے گا اور نہ زمین شق ہو جائے گی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمیل احمد عدیل

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

غالبؔ کے ہم عصر مومنؔ نے کیا خوبصورت مقطع کہا ہے: ؎

کیوں سُنے عرضِ مضطرب مومنؔ
صنم آخر خدا نہیں ہوتا!!!

مطلب بڑا واضح ہے کہ جو ''عرضِ مضطرب'' نہیں سنتا/نہیں سن سکتا/نہیں جواب دیتا/نہیں جواب دے سکتا۔ وہ صنم/ بت ہی ہوسکتا ہے۔ خدا نہیں۔ گویا خدا وہی ہے جو ''عرضِ مضطرب'' کو نہ صرف سنتا ہے بلکہ باقاعدہ جواب بھی دیتا ہے۔

اچھا صاحبو! بعض اوقات حکمت کی بات کسی ایسی جگہ سے بھی مل جاتی ہے کہ سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ چند دن ہوئے سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے کتب فروش کے ہاں سے ہمیں ایک بڑی مزے کی کتاب ملی۔ ٹائٹل ہے اس کا ''داستان یوسفؑ''۔ چھوڑیئے مصنف کے اسم گرامی کو، کہ اصولی طور پر ایسی کتابوں کا مصنف کوئی نہیں ہوتا۔ ہماری نظر میں ایسی نادر کتب کا مواد ''الہامی'' ہوتا ہے کیونکہ مصنف کا جو، جی چاہتا ہے لکھ ڈالتا ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

چنانچہ ایسی نایاب تصانیف میں موجود معارف کے مآخذ کی جستجو خالص بے ذوقی ہے۔ بس کہہ جو دیا کہ ان کے مندرجات ''الہامی'' ہوتے ہیں۔ یہاں صریرِ خامہ کا عنوان بجز ''نوائے سروش'' کے اور کچھ ممکن ہی نہیں۔ سچی بات ہے حقائق کا مطالعہ کرتے کرتے جب ہم تھک جاتے ہیں تو پھر ایسی داستانوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یوں چند ثانیوں میں تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ مجرب نسخہ ہے آپ بھی آزما کر دیکھئے۔

مذکورہ شاہکار میں جس طرح لطف لے لے کر قصۂ یوسف زلیخا بیان ہوا ہے، بس وہ پڑھنے سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ سارا رومانوی ادب ایک طرف اور یہ داستان ایک طرف۔ اچھا دورانِ مطالعہ ایک مقام ایسا آیا کہ ہم دل تھام کر رہ گئے، ہمیں ایسا لگا کہ ہم ''لوسٹوری'' نہیں پڑھ رہے ہیں بلکہ کسی عظیم Rationalist مفکر کی تحریر پڑھ رہے ہیں۔ واقعتاً حقیقت کی ایسی جہت رقم کر دی گئی تھی کہ ہزاروں عقلی کتب اس پر قربان کی جاسکتی ہیں۔

واضح کر دیں اس اقتباس کی واقعیت کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ کر نہ دیکھا جائے' بس اسکے متن میں موجزن عرفان کی سطح کو مس کر کے محسوس کیا جائے۔ یقین کیجئے تفکر چاروں اور اجال کر دے گا۔

ص ۱۶۸ پر سرخی ہے: ''زلیخا کی بے کسی''۔ اس کے تحت منظر یہ بیان ہوا ہے کہ مدید مدت گزر گئی ہے۔ وہی زلیخا جو کبھی انتہائی حسین وجمیل ملکہ ہوا کرتی تھی' اب بے حد برے حالوں' خراب وخستہ پڑی ہوئی ہے۔ بہت بوڑھی ہو چکی ہے' کوئی اس کا پرسان حال نہیں۔ بینائی بھی ختم ہو چکی ہے' کمر کمان ہو چکی ہے' چہرہ جھریوں سے اٹا ہوا ہے' یہ مفلس ومحتاج ضعیفہ جنگل میں ایک جھونپڑی میں پڑی کراہ رہی ہے:

''نیز زلیخا واجب الرحم' مردہ صورت کے پاس پیتل کا ایک بت ہے جسے کبھی کبھی جھولی میں سے نکال کر وہ اپنے آگے رکھتی ہے اور اسے سجدہ کرتی ہے۔

''ایک روز خود بخود اس کے دل میں خیال آیا کہ میں جس بت کو اپنا خدا سمجھتی ہوں۔ افسوس آج تک اس نے میرا کوئی کام نہیں کیا اور خاص کر جب یوسف ہی کو اس نے نہیں ملایا تو بے شک یہ اس قابل ہے کہ اس کی پوجا چھوڑ دی جائے اور اسے توڑ کر پھینک دیا جائے چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور پھر بعد میں یہ سوچنے بیٹھی کہ اس سے یوسف کبھی کبھی مانگا کرتی تھی اب کس سے مانگوں؟

پھر اسی وقت خیال آیا کہ دیوانی اب یوسف کے معبود سے یوسف کو مانگ اور دیکھ کہ اس میں بھی یوسف کے ملانے کی قدرت ہے یا نہیں؟ یہ کہہ کر خدا کی جناب میں سجدہ کیا اور اس سجدہ میں اس نے وہی یوسف کا سوال پیش کیا۔'' (ص ۱۶۹)۔

ظاہر ہے اس کے بعد وصال یوسف کا یہ منظر ہے کہ زلیخا کی دعا ختم نہیں ہوئی تھی کہ عرشِ معلیٰ سے یوسف علیہ السلام کے نام حکم آیا کہ اے یوسف! ایک عاجز بندی کی دعا سے دریائے رحمت جوش میں آ گیا ہے اور ہم نے اس کی فریاد سنی۔ جاؤ اور ابھی جاؤ اور ہماری نیک بندی کا مزاج پوچھو۔۔۔!

دوستو! پہلے آپ ایک شعر سنئے: ؎

جب ہم ہی نہ مہکے پھر صاحب
تم بادِ صبا کہلاؤ تو کیا!

یعنی وہ خدا جس نے زلیخا کی دعا قبول کر کے اسے یقین دلا دیا کہ میں پیتل یا کانسی کا مجسمہ نہیں ہوں بلکہ ایک جیتا جاگتا خدا ہوں۔ اگر آج ہم اپنی عرضی اسی خدا کے حضور پیش کریں اور ہمیں کوئی Proper Response نہ ملے تو پھر ہم کیا نتیجہ اخذ کریں گے؟۔۔۔؟ یہ سوال ایسا نہیں کہ اس کا نوٹس نہ لیا جائے۔ ہمارے کل نظریات کی یہ واحد اساس ہے۔ خود خدا نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے:

''جب میرے بندے مجھے پکاریں تو کہہ دو کہ میں ان کے قریب ہوں۔ ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔'' (۲/۱۸۶)؛ (۶۰/۴۰)۔

''وہ کون ہے جو قلبِ مضطر کی پکار کا جواب دیتا ہے اور مصیبت رفع کرتا ہے؟'' (۶/۴۱)۔

اس مضمون کی کیا کوئی ایک آیت ہے؟ قرآن بھرا پڑا ہے۔ دیکھئے دنیا کو کتنا بڑا چیلنج دے دیا گیا ہے۔ غور کی جا ہے اگر دنیا اس اصول کے تحت خدا کو قبول کرنا چاہے تو کیا کوئی ایک فرد بھی (خاکم بدہن) خدا کو مان سکتا ہے؟ مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ اور خاص طور پر جب ساتھ ہی یہ تاکید بھی ہو:

''خدا کے سوا کسی کو نہ پکارو۔ وہ تمہیں نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔ وہ تمہاری مصیبت دور نہیں کر سکتے۔'' (۶/۱۷)۔

دیکھئے کس قدر آسان سی بات ہے کہ ایک کینسر کا مریض علاج کرائے بغیر پیتل تانبے سے بنے ہوئے بت کو سامنے رکھ کر اگر یہ دعا مانگے کہ

اے بھگوان! مجھے بھلا چنگا کر دے۔

اور ہم بطور شاہد اس دعائیہ کارروائی کے بعد کیا کوئی برعکس نتیجہ نکال سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ وگرنہ یوں بت شفا دینے لگ جائیں تو ہمیں انہیں خدا تسلیم کر لینے میں کوئی عذر نہیں ہونا چاہئے۔ سچی بات ہے کہ بت اگر کینسر کے مریض کو ٹھیک کر دے، ہمیں اس بت کو خدا ماننے پر کوئی اصولی اعتراض نہیں ہونا چاہئے کہ خدا کی تو تعریف ہی یہ ہے کہ وہ پکار کو سن کر مصیبت کو رفع کرتا ہے۔ پر ہم بت کو کبھی خدا نہیں مان سکتے اس لئے کہ وہ بے حس وحرکت، بے چارہ، بے جان ہمارا کچھ سنوار سکتا ہے نہ بگاڑ سکتا ہے۔

اب اسی بنیاد پر کوئی حقیقی خدا کا Test کرنے بیٹھ جائے تو جانتے ہیں نتیجہ کیا نکلے گا؟ ہاں آپ جانتے ہیں، اچھی طرح جانتے ہیں کہ دنیا سے کینسر کے موحد مریض ختم نہیں ہو گئے۔ وہ خدا کے منکر ہیں نہ ان کے متعلقین سے دعاؤں کے باب میں کوئی کوتاہی ہوئی ہے۔ ایسے میں خدا کی پوزیشن کیا بن جاتی ہے؟ خود غور کر لیجئے۔ سوال یہ ہے کہ جب قرآن اترا تھا تب بت پرستی لوگوں کی روح کا حصہ تھی، لہو کے اندر سرایت کر چکی تھی۔ کیا اس نوعیت کا سوال جواب وہ نہیں کر سکتے تھے؟ اور کیا وہ اتنے گئے گزرے اور غبی تھے کہ انہوں نے اللہ کے نبی ﷺ سے ایسے (حقیقتاً اوٹ پٹانگ ہی سہی) سوالات نہیں کئے ہوں گے؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ان آیات کو ایسے استفہامات کے تناظر میں رکھ کر نہ دیکھا گیا ہو۔

کیا جواب ہوسکتا ہے ان کا؟ یہی کہ ڈاکٹر حکیم سے علاج بھی کراؤ اور دعائیں بھی جاری رکھو۔ کیا یہ رعایت بتوں کے لئے بھی ہے؟ ظاہر ہے پھر بتوں کو بھی یہ Edge حاصل ہونا چاہئے۔ اور پھر نتائج معلوم ہے کیا

ہوں گے؟ ہو گا جناب یہ! کہ چند بت پرست مریض شفایاب ہو جائیں گے اور باقی نہیں ہوں گے۔ اس طرح چند موحد مریض صحت مند ہو جائیں گے باقی ویسے ہی رہیں گے۔ بات تو وہیں کی وہیں رہی۔ خدا کا خدا ہونا تو ثابت نہ ہوا۔ ڈاکٹر کا ڈاکٹر ہونا البتہ ثابت ہو گیا۔

ہم تو یہ کہتے ہیں۔ بھائیو! ہٹاؤ ڈاکٹر واکٹر کو' سیدھا سیدھا خدا اور بت کو آزما کر دیکھو کہ سچا خدا کون سا ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ دعا ''مانگنے'' کی چیز ہی نہیں ہے۔ یہ تو ''کرنے'' کی شے ہے۔ یہ ایک ''عمل'' ہے۔ عاملوں والا عمل نہیں بلکہ مسلسل عمل' سچ مچ کا عمل۔ ہاں ایک درجے میں وہی عمل جو پروفیشنل عامل اپنے لئے کرتے ہیں کہ ضعیف الاعتقاد لوگوں کو ٹھگ کر' ان سے اینٹھے ہوئے پیسوں سے ریڑھی سے سیب خریدتے ہیں' موبائل میں کارڈ لوڈ کرتے ہیں۔ ان سے کوئی پوچھے اے عاملو! دوسروں کو تو تم نے ''عمل'' بتا دیا کہ اتنی مرتبہ فلاں تسبیح پڑھو تو تمہارے رزق میں اضافہ ہو جائے گا لیکن تم نے خود پر یہی عمل کیوں نہیں کر لیا تا کہ تمہیں اپنے معمل کا کرایہ نہ دینا پڑتا؟ مطلب یہ ہے کہ عمل' عمل ہے۔ ایک دم متعین۔ اس کی ماہیت اور اس کے نتیجے کو کوئی مائی کا لعل اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتا۔ چاہے وہ کوئی کرے۔ بس یہی ''دعا'' ہے۔ ہاں خدا سے دعا کرنے کے معانی مختلف ہیں کہ ہم جو عمل کریں گے اس یقین کے ساتھ کریں گے کہ اس عمل سے منسوب ضابطہ خدا نے بنایا ہے۔ اور پھر اس عمل کے لئے جو طریق کار اس نے وضع کیا ہے' اس کے مطابق ہم اسے تکمیل تک پہنچائیں گے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس نے کہا ہے' نتائج کے لحاظ سے یہ منہاج اور یہ منزل زیادہ مفید ہے اور ہم نے یہ تجربہ بھی کر کے دیکھ لیا ہے کہ حقیقی افادیت اسی Methodology کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔

وگرنہ دعا بالفرض محض مانگنے' پکارنے والی ہی کوئی چیز ہے تو پھر آہوں' سسکیوں' نالوں' فریادوں کا جو جواب آ رہا ہے' اسے بس ''جواب'' ہی سمجھئے کہ رونے' چیخنے سے کسی کا آج تک کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ یاد رکھئے ''قبولیتِ دعا'' کا یقینی لازمی معیار یہی ہے کہ پراپر جواب آئے۔ اگر جواب نہیں آتا تو سمجھ لیجئے سوہنے رب کے در پر دستک نہیں دی گئی' کسی بت کے آگے گڑگڑایا جا رہا ہے۔

ہم کیا کر رہے ہیں کہ خدا سے بالکل اسی طرح مانگتے ہیں جس طرح پجاری بت سے طلب کرتا ہے۔ ہماری آرزو پوری ہوتی ہے نہ پجاری کی مطلب برآری ہوتی ہے۔ ہم اس عبث فعل سے دستکش ہوتے ہیں نہ بت پرست اس شغل کو ترک کرتا ہے۔ نتیجہ معلوم! یہاں مذہبی پیشوائیت کے رزق کا مسئلہ حل ہے' خانقاہیں آباد ہیں' عاملین آسودہ ہیں۔ وہاں برہمنیت کو فکرِ معاش نہیں ہے' مندروں کی رونق قابلِ دید ہے' پنڈت پروہت مثالی

موٹائی والی گردنوں کے مالک ہیں۔

یہ سب یونہی رہے گا جب تلک ہمیں شعور نصیب نہیں ہو جاتا کہ بندے کا خدا سے تعلق کس معنویت کا حامل ہے؟ اور یہ تعلق صرف اور صرف قوانینِ خداوندی کے عرفان تک ''محدود'' ہے۔ آپ سوچئے بھلا اللہ کو قوانین بنانے کی کیا ضرورت پڑی ہوئی تھی؟ اسکی الوہیت کیا کائنات کی تخلیق اور کائناتی دساتیر کی تشکیل کے بغیر ادھوری تھی؟ نہیں وہ ہر لحاظ سے تب بھی مکمل تھا۔ اس نے یہ تمام قوانین ہمارے لئے بنائے ہیں۔ کائناتی بھی' سماجی بھی۔ اب ہم انہیں بائی پاس کر کے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ یہی ہمارا ''جبر'' ہے' یہی ہمارا ''اختیار'' ہے۔

اس عظیم خدا کے تشکیل فرمودہ قوانین میں سے ایک قانون ''دعا'' بھی ہے جس کا مفہوم یہی ہے کہ انسان کسی بھی آرزو کو پورا کرنے کے لئے سب سے پہلے یہ جائزہ لے آیا یہ تمنا مشیت کے پروگرام کے ساتھ ہم آہنگ بھی ہے یا نہیں؟ اگر اس کی فراست اسے یقین دلا دیتی ہے کہ یہ سمت کے اعتبار سے درست ہے تو پھر اگلے مرحلے میں داخل ہونے کی اسے اجازت ہے۔ اب اس نصب العین کے حصول کے لئے اسے تگ و تاز کرنا ہے۔ ہاں اس تفکر کے ساتھ کہ اس مراد کو پانے کے لئے خدا کا بنایا ہوا روٹ کیا ہے؟ یاد رکھئے' قانونِ خداوندی کے صحیح فہم کا مطلب پچاس فی صد دعا کی قبولیت ہے۔ باقی پچاس فی صد وہ متواتر جدوجہد ہے جسے عزم کی روشنی اور استقامت کے نور کے ساتھ جاری رکھنا ہے۔ اب منزل نے خود چل کر راہی سے گلے ملنا ہے۔ ایسا ہوتا ہے اور ایسا ہی ہوتا ہے۔

باقی خالی دعائیں کرنے والوں اور ہنگامی صورتحال میں یعنی وقتِ ضرورت ہی ''خدا کو طلب'' کرنا' کسی طرح مستحسن نہیں ہے۔ ایسے مطلب پرستوں کو خدا نے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا۔

> ''حمل کے وقت خدا سے دعائیں کرتے ہیں کہ تندرست' صحیح وسالم بچہ پیدا ہو گیا تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے۔ بعد میں کفر کرنے لگ جاتے ہیں۔'' (۱۹۰-۱۸۹/ ۷)۔
>
> کشتی طوفان میں پھنستی ہے تو گڑگڑانے لگ جاتے ہیں۔ جب وہ ساحل پر پہنچ جاتی ہے تو کفر و شرک کرنے لگ جاتے ہیں۔ (۶۷/ ۱۷)۔

یہ رویہ کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ لیکن انسان بھی عجیب شے ہے' ضرورت کے تحت وہ ''خدا پرست'' ہے۔ کام نکلتے ہی مکر جاتا ہے۔ بعض لطائف ظرائف میں بھی Wisdom ہوتی ہے۔

کہتے ہیں کوئی شخص ساحلِ سمندر پر Walk کر رہا تھا۔ ایک چھل پانی کی ایسی آئی کہ اسے بہا کر سمندر میں لے گئی۔ دو چار غوطے آئے تو وہ چیخا۔ اے خدا! پلیز مجھے بچا لے۔ میں ایک دیگ مانتا ہوں' تیری راہ میں خیرات

کروں گا۔ اب ہوا یہ کہ پانی کی ایک چھل اور آئی اور اسے باعزت ساحل پر پھینک گئی۔ موصوف کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھے اور بولے:

کیہڑی دیگ؟

''خدا کی کرنی'' کیا ہوئی کہ ایک اور زبردست موج آئی اور اسے دوبارہ بہاتی ہوئی گہرے پانیوں میں لے گئی۔ ناک منہ میں پانی گیا تو فوراً چلایا اے مالک! میں نے تو پوچھا تھا:

کیہڑی دیگ؟ پلاؤ والی یا زردے والی؟

ہم یہی عیاری اپنے خدا سے کرتے رہتے ہیں اور مسرور ہیں کہ اسے فریب دینے میں کامران ٹھہرے ہیں۔ درآں حالیکہ ہم خود کو فریب دیتے ہیں۔

اب آخر میں خدا سے ہی پوچھ لیتے ہیں کہ اس کا دعاؤں کے سلسلے میں قطعی حتمی قانون کیا ہے؟

کوئی شخص اگر دریا کے کنارے کھڑا پانی پانی کہتا رہے تو پانی اس کے منہ میں نہیں آ جائے گا۔ اس کی شدتِ تشنگی اپنی جگہ لیکن پانی تو اپنی کوشش ہی سے حاصل ہو سکے گا۔ (۱۳/۱۴)۔

جو خدا کے قانون سے انکار کرے اس کی دعا رائیگاں جاتی ہے۔ (۱۳/۱۴)۔

حضرت موسیٰؑ نے جب دعا کی تھی کہ انہیں فرعون کے خلاف کامیابی عطا ہو تو جواب میں کہا کہ ہم نے تمہاری دعا سن لی ہے۔ اب تمہارے لئے ضروری ہے کہ اپنے پروگرام پر جم کر کھڑے ہو جاؤ اور ان لوگوں کا اتباع مت کرو جنہیں علم نہیں۔ یعنی خدا کے قانون کو مضبوطی سے تھام کر آگے بڑھتے چلے جانا' یہ ہے پریکٹیکل دعا۔

باقی کرنے کو ہم دن رات انفرادی سطح پر بھی دعائیں کر ہی رہے ہیں۔ نتائج ظاہر و باہر ہیں۔ ہماری اذیتیں اور بڑھ رہی ہیں۔ پھر خدا پر ہم Moral Pressure بڑھانے کے لئے ایک میدان میں بیس پچیس لاکھ افراد جمع کر لیتے ہیں اور رو رو کر نہایت ہی تضرع کے ساتھ دعائیں کرتے ہیں۔ بیماریاں' ناداریاں' مصیبتیں' ذلتیں جوں کی توں موجود رہتی ہیں۔ ہم ان اجتماعی دعاؤں میں خدا سے کہتے ہیں' مسلمانوں کے فلاں فلاں علاقے دشمن سے آزاد کرا دے لیکن وہ مطلوبہ آزادی ہمیں نہیں ملتی۔

ہم کیا سمجھتے ہیں یہ پریکٹس جاری رکھتے ہوئے ہم خدا سے کبھی شاکی نہیں ہوں گے؟ یہ ہماری بھول ہے۔ عملاً ہم خدا سے گریزاں ہو چکے ہیں اور تیزی سے وہ طبقہ بھی فروغ پا رہا ہے جو زبان سے بھی اقرار کر رہا ہے کہ معاذ اللہ یہ سب ایسے ہی ہے۔ یہ کفر بہت جلد ہمارے اوپر چھا جائے گا چاہے اس کا اظہار سرِ دست انہی محتاط الفاظ میں اسیر ہو:

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

انتظامی امور کی اطاعت

عقل انسانی کا خاصہ و تقاضہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنا مفاد پیش نظر رکھتی ہے۔ انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی۔ جس طرح ہر فرد اپنا مفاد تلاش کرتا ہے اسی طرح ہر قوم اپنے مفاد کے پیچھے سرگرداں رہتی ہے۔ قرآن کریم نے مسلمانوں کے وجود کا مقصد ہی یہ متعین کیا ہے کہ کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر (۳/۱۱۰)۔ اے جماعت مومنین تمہیں اس مقصد کے لئے اٹھا کھڑا کیا گیا ہے کہ تم انسانیت کے لئے نفع رساں ہو۔ اور اس کے لئے ضروری ہے کہ تم ساری انسانیت کو معروف کا حکم دو اور منکر سے منع کرو۔ حجِ بیت اللہ شریف کے مقاصد میں بھی واضح کیا گیا ہے کہ حج کا سالانہ اجتماع اس لئے ہوتا ہے کہ وہاں انسانیت کو فائدہ پہچانے کے طریقوں پر غور کیا جائے اور غیر مسلم اس کو خود اپنی نگاہوں سے دیکھ لیں۔ لیشھدو منافع لھم (۲۲/۲۸)، سورہ حدید میں ارشاد ہوتا ہے کہ لوہے کو اس لئے نازل کیا گیا کہ اس کے ذریعے عدل و انصاف کا وہ نظام قائم ہوتا ہے جس سے ساری انسانیت کو نفع پہنچتا ہے۔ آج مسلمان ساری دنیا میں تشدد پسند شمار کئے جاتے ہیں اور اس سے اسلام کی توسیع و اشاعت کو سخت صدمہ پہنچ رہا ہے۔ حالانکہ اسلام کی اشاعت و توسیع کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تشدد سے بالکلیہ اجتناب و احتراز کرکے، ساری دنیا کو علمی استدلال و فکری براہین سے یہ بات باور کرائی جائے کہ اسلام کا نظام صرف مسلمانوں کے فائدہ کے لئے ہی نہیں ہے بلکہ یہ ساری دنیا کے لئے منفعت بخش ہے، اسلام کا اللہ ساری دنیا کا رب ہے۔ وہ ہی سارے عوالم کا پروردگار ہے۔ اس کا نظام ساری مخلوق کی بھلائی چاہتا ہے۔ قرآن کریم کی اقتداء اختیار کرنے سے دنیا میں امن کو فروغ ہوگا اور اس کے نظام کو قائم کرنے سے ہی ہر قوم کا فائدہ وابستہ ہے۔

تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر یہ اس امت کے خیر امت ہونے کی دلیل بیان

ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اس لئے خیر امت ہو کہ تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس منصب پر تم نسل یا نسب کی بنا پر سرفراز نہیں ہوئے ہو جیسا کہ اہل کتاب نے اپنے لئے خیال کر رکھا تھا' بلکہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ذمہ داری نے تمہیں اس کا استحقاق دیا ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ اس منصب کا حصول صفات و ذمہ داریوں کے ساتھ مشروط و منوط ہے کسی مخصوص گروہ کے ساتھ اللہ نے اس کو باندھ نہیں چھوڑا ہے اور اس سے یہ بات بھی واضح ہے کہ چونکہ مسلمان آج کل اس منصب کے ساتھ متصف نہیں ہیں' اسی وجہ سے اب وہ خیر امة کہلانے کے بھی مستحق نہیں ہیں۔

ساری انسانیت کو نفع پہچانے اور معروف و منکر کو جاری کرنے اور خیر امة کے مرتبہ پر فائز ہونے کے لئے قرآن کریم کے نظام کو قائم کرنا نہایت ضروری بات ہے۔ قرآنی حکومت کے احکامات معروف اور اس کے مناہی منکر ہوتے ہیں۔ ان کا اجراء صرف اس وقت ہی ہو سکتا ہے جبکہ اسلامی نظام یا قرآنی حکومت ہو۔ قرآن کریم نے اس کی وضاحت بخوبی فرمائی ہے۔ شرع لکم من الدین ما وصی به نوحا والذی اوحینا الیک وما وصینا به ابراهم و موسی و عیسی ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیه (۴۲/۱۳)۔ اس نے تمہارے لئے وہی دین مقرر فرمایا ہے جس کی ہدایت اس نے نوح کو فرمائی اور جس کی وحی ہم نے تمہاری طرف کی اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم و موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا کہ اس دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ پیدا نہ کرو۔ اس دین کے متعلق تمام امتوں کو ہدایت کی گئی کہ اس دین کو ہر حال میں قائم رکھنا اور اس دین میں اختلاف نہ ہونے پائے۔ کیونکہ اختلاف ہونے کے بعد دین قائم نہیں رہتا پھر وہ مذہب کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں قائم رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو عملی شکل میں جاری رکھا جائے۔ لوگوں کی نگرانی کی جائے کہ وہ اس کے عملاً جاری کرنے سے غافل یا منحرف نہ ہونے پائیں۔ اسی کی تاکید دوسری جگہ فرمائی وکذلک جعلنا کم امة وسطا لتکونوا شهداء علی الناس و یکون الرسول علیکم شهیدا (۲/۱۴۳)۔ اور اسی طرح ہم نے تمہیں وسطی یعنی بین الاقوامی مرکزی امت قرار دیا ہے تاکہ تم امامت امم کے منصب کے مطابق لوگوں کے نگران رہو اور تمہارا نگران ہمارا رسول ہو۔ یہ امت وسطیٰ کے فریضۂ منصبی اور اس کے قیام کی ضرورت کا بیان ہے اس آیۂ کریمہ کے ذیل میں جو کچھ ''تدبر قرآن'' میں مرقوم ہے وہ ہماری توجہ اور غور کا

متقاضی ہے۔ اس میں ارشاد ہوتا ہے۔

''رسول تم پر گواہ ہو' اور تم لوگوں پر گواہ ہو سے یہ بات واضح طور پر نکلتی ہے کہ شہادت علی الناس کا جو فرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بحیثیت رسول کے تھا۔ آپ کے بعد آپ کی امت کی طرف منتقل ہوا ہے اور اب یہ اس امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر دور' ہر ملک اور ہر زمان میں لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دے اور اگر وہ اس فرض میں کوتاہی کرے گی تو اس دنیا کی گمراہیوں کے نتیجے بھگتنے میں دوسروں کے ساتھ وہ بھی برابر کی شریک ہو گی۔'' اس کے بعد فوری طور پر مزید تحریر فرماتے ہیں۔

''ہمارے ارباب تاویل نے عام طور پر اس شہادت کو آخرت سے متعلق مانا ہے کہ یہ امت گمراہوں کے خلاف انبیاء کی تائید میں آخرت میں شہادت دے گی کہ ان گمراہوں کو اللہ کا دین پہنچ چکا تھا اس کے باوجود انہوں نے گمراہی کی روش اختیار کی۔ لیکن ہمارے نزدیک اس تخصیص وتحدید کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس امت کو شھداء اللہ ہونے کا مرتبہ آخرت میں بھی حاصل ہوتا لیکن آخرت میں یہ مرتبہ اسی وجہ سے حاصل ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اس کو اس منصب پر سرفراز فرمایا ہے۔ جو امت اس دنیا میں دین حق کی گواہ ہے ظاہر کہ وہی آخرت میں بھی اس پوزیشن میں ہوگی کہ گواہی دے کہ لوگوں کو اللہ کا دین ٹھیک ٹھیک پہنچائیں''۔ (''تدبر قرآن'' جلد اول' صفحہ ۳۶۵)

''رسول تم پر گواہ ہو' اور تم لوگوں پر گواہ ہو''۔ آیۂ کریمہ کے اس حصہ کی صحیح یا غلط تعبیر سے ہی مذہب اور دین کا فرق واضح ہوتا ہے۔ ہمارے علماء کرام جو مذہب کے داعی ہیں وہ حضور کی موجودگی میں رسول کے معنے حضور کی ذات اور آپ کے انتقال کے بعد اس کے معنے کتب احادیث وروایات لیتے ہیں' اس لئے انہیں اس آیت میں یہ دشواری پیش آتی ہے کہ حضور کے بعد' حضور کی نگرانی کی تشریح کس طرح کی جائے۔ لیکن دین کے تصور کے مطابق اس آیہ کریمہ کی تشریح میں قطعاً کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ جیسا کہ تدبر قرآن میں تحریر کیا گیا ہے۔ ''جو فرض حضور پر بحیثیت رسول کے تھا یہ آپ کے بعد' آپ کی امت کی طرف منتقل ہوا ہے۔'' اور اسلامی حکومت کا سربراہ ہی بحیثیت رسول کے جانشین و خلیفہ کے ساری انسانیت کا نگران ہوتا ہے۔

دین و مذہب میں تفریق وتمیز کرنے کے لئے یہ نکتہ ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ قرآن کریم قیامت تک کے لئے مسلمانوں کے واسطے ایک ابدی ضابطۂ حیات ہے۔ اس میں حضورﷺ کی حیات مبارکہ کے دوران ہزاروں جگہ آپ کو مخاطب کر کے' مختلف احکامات دیئے

گئے ہیں۔حضور کی حیات مبارکہ کے دوران ان کا مصداق ومنطوق خود حضور کی ذات والا واعلیٰ صفات تھی۔لیکن آپ کی وفات کے بعد' ان احکامات کا مصداق و معانی آپ کے خلفاء کرام یعنی اسلامی حکومت کے سربراہان ہوں گے۔آپ مندرجہ ذیل قرآنی احکامات پر غور فرمائیں یہ بات آپ پر واضح ہو جائے گی۔کیونکہ حضور کی وفات کے بعد نہ تو وہ احکام بے اثر ہو گئے ہیں اور نہ ہی ان احکام کا اتباع ختم کر دیا گیا ہے۔اگر ان احکامات کو آپ کی وفات کے بعد آپ کے جانشینوں کی طرف منتقل ہونا ہی نہیں تھا اور وہ آپ کے بعد بے کار ہو جانے تھے' تو خدا کی اس عظیم کتاب میں جو قیامت تک کے لئے ضابطہ حیات مقرر کی گئی ہے اور جو قیامت تک محفوظ رہے گی' ان احکام کو محفوظ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

مال فئے وہ مال ہوتا ہے جو بغیر کسی لشکر کشی کے حاصل ہو جائے۔اس میں حضور کے دَور' یا اس کے بعد کے ادوار کی کوئی قید یا شرط نہیں ہے۔حضور کے بعد بھی اگر کسی مسلمان لشکر کو اس طرح کا مال حاصل ہو جائے' وہ مال فئے ہی شمار ہو گا۔یہ اموال حضور کی ذاتی ملکیت نہیں تھے اور کسی وقت بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔تفسیر عثمانی میں مرقوم ہے۔ ''اب اموال فئے کے متعلق عام ضابطہ بتلاتے ہیں۔یعنی فئی پر قبضہ رسول کا اور رسول کے بعد امام کا ہو گا کہ اسی پر یہ خرچ پڑتے ہیں۔'' اس کے بعد تحریر ہے یعنی مال و جائیداد وغیرہ جس طرح پیغمبر اللہ کے حکم سے تقسیم کرے اسے بخوشی و رغبت قبول کرو' جو ملے لے لو' جس سے روکا جائے رک جاؤ' اور اسی طرح اس کے تمام احکام اور اوامر ونواہی کی پابندی کرو۔'' (تفسیر عثمانی' صفحہ ۷۲۵)۔ جیسا کہ حضرت نے خود تسلیم فرمایا کہ رسول کے بعد امام مال فئے کا مالک ہوتا ہے' اسی طرح تمام مسلمان رسول اللہ کے دور میں خود رسول اللہ کے اور اس کے بعد امام کے احکام کی اطاعت کے پابند ہوں گے۔ یہاں رسول سے مراد حضور کے دور میں خود حضورﷺ ہیں اور ان کے بعد امام وقت ہے۔

اسی طرح مال غنیمت کی صورت ہے کہ حضورﷺ کی موجودگی میں بحیثیت سربراہ مملکت یہ آپ کی تحویل میں ہوتا تھا اور آپ کے بعد امام کی تحویل میں ہو گا۔تدبر قرآن میں ارشاد ہے۔''میرے ذہن میں بار بار یہ بات آتی ہے کہ رسول کا یہ حق بحیثیت رسول کے نہیں ہے بلکہ **اسلامی ریاست کے سربراہ کی حیثیت** سے بیان ہوا ہے۔ رسول اللہ' اللہ کے رسول بھی تھے اور آپ کے ہاتھوں مدینہ منورہ میں جو اسلامی حکومت قائم ہوئی' اس کے قائد و سربراہ بھی۔ جہاں تک فریضۂ رسالت کا تعلق ہے اس پر آپ کو اللہ تعالیٰ نے مامور فرمایا تھا اور قرآن میں اس

بات کی تصریح ہے کہ اس نے اپنے رسول کی ساری ذمہ داریاں براہ راست اپنے اوپر لی تھیں لیکن ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے جب کہ آپ کے مبارک اوقات کا لمحہ لمحہ اس کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں صرف ہو رہا تھا یہ ضروری ہوا کہ اس مال میں آپ کا حق بھی رکھا جائے۔ یہ حق درحقیقت ریاست کے سربراہ کا حق تھا جو حضور کے وصال کے بعد آپ سے آپ حضور کے خلیفہ اور جانشین کی طرف منتقل ہو گیا۔'' (تدبر قرآن' جلد سوئم' صفحہ ۴۸۱)۔

آپ نے غور فرمایا کہ کس طرح حضرت نے کھل کے ہمارے موقف کی تائید فرمائی ہے اور **خط کشیدہ** الفاظ میں کس طرح حضور کی دو حیثیتیں' ایک بطور رسول کے اور دوسری اسلامی ریاست کے سربراہ کی' الگ الگ متمیز کر کے دکھا دیں۔

مال غنیمت ہی کے سلسلہ میں تفسیر کثیر میں ارشاد ہے۔ ''اور لوگ کہتے ہیں کہ خمس میں امام وقت مسلمانوں کی مصلحت کے مطابق جو چاہے کر سکتا ہے۔ جیسے کہ مال فئے میں اسے اختیار ہے۔ ہمارے شیخ امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ یہی قول حضرت امام مالک کا ہے اور اکثر سلف کا ہے اور یہی سب سے زیادہ صحیح قول ہے۔ جب یہ ثابت ہو گیا اور معلوم ہو گیا تو یہ بھی خیال رہے کہ خمس جو حضور کا حصہ تھا اسے اب آپ کے بعد کیا کیا جائے تو بعض کہتے ہیں کہ اب یہ حصہ امام وقت یعنی خلیفۃ المسلمین کا ہو گا۔'' (تفسیر کثیر' جلد دوم' صفحہ ۲۶۳)۔

مال فئے کے سلسلہ میں تفسیر عثمانی کا حوالہ اوپر دیا گیا تھا۔ مال غنیمت کے متعلق بھی انہوں نے تحریر فرمایا ہے کہ ''بعض علماء کے نزدیک حضور کے بعد امیر المومنین کو اپنے مصارف کے لئے خمس الخمس ملنا چاہئے۔'' (تفسیر عثمانی' صفحہ ۲۴۱)۔

مندرجہ بالا احکامات کے اقتباسات کو پیش خدمت عالی کر کے' یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ اس قسم کی آیات کریمات میں حضورﷺ کی حیات مبارکہ میں اس قسم کے احکام کے مخاطب و مصداق حضور خود تھے اور آپ کی وفات کے بعد اس کے مخاطب اور منطوق آپ کے جانشین ہوں گے۔ چنانچہ خود ہمارے مفسرین کرام صلوٰۃ الخوف کے بارے میں متفق ہیں کہ حضور کے بعد یہ حکم آپ کے خلیفہ کی طرف منتقل ہو گیا ہے (واذا کنت فیھم فاقمت لھم الصلٰوۃ) (۴/۱۰۲)۔ جب اے رسول آپ ان میں موجود ہوں تو آپ انہیں نماز پڑھائیں) اور اس طریقہ سے ہر امام لشکر نماز پڑھا سکتا ہے' حضور کی اپنی زندگی کے دوران اس کے مخاطب آپ تھے' اور آپ کی وفات کے بعد جو آپ کا خلیفہ ہو گا' وہ اس کا مخاطب ہو گا۔

صاحبِ ''تدبر قرآن'' کا یہ فقرہ کہ ''میرے ذہن میں بار بار یہ بات آتی ہے کہ رسول کا یہ حق بحیثیت

رسول نہیں بلکہ اسلامی ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے بیان ہوا ہے۔'' جو اوپر مال غنیمت کے سلسلہ میں Quote کیا گیا ہے۔ یہ فقرہ قرآن فہمی کے بارے میں کلیدی مقام رکھتا ہے' اس فرق و امتیاز کو پیش نظر نہ رکھنے کی وجہ سے قرآن فہمی میں بے شمار مشکلات درپیش آتی ہیں اور اسی کو درست طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے' فلہٰذا اسی فقرہ کی مزید وضاحت پیش خدمت عالی کی جاتی ہے۔

قرآن کریم کی رو سے نبی اور رسول ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہوتے ہیں ان میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ البتہ جب نبوت عطا ہوتی تھی' تو یہ اس کی ذاتی حیثیت ہوتی تھی جس میں اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایات عطا ہوتی تھیں اور وہ ان ہدایات کے مطابق ایک ریاست و اسٹیٹ قائم کرتا تھا۔ یہ اس کی رسالت کی حیثیت تھی۔ اور اس کا یہ منصب باعتبار سربراہ مملکت کے ہوتا تھا اور رسول یا رسول کا قائم کردہ نظام اس کے سامنے کبھی مغلوب نہیں ہو سکتا تھا۔ جیسا کہ سورہ الصّٰفّٰت میں ارشاد ہے۔ ولقد سبقت کلمتنا لعبادنا المرسلین انھم لھم المنصورون (۳۷/۱۷۲)۔ اور ہم نے پہلے ہی یہ فیصلہ کر رکھا ہے یہ ہمارا قانون ہے کہ ہمارے مرسلین جو ہمارا پیغام دوسروں تک پہنچائیں گے انہیں ضرور ہماری تائید حاصل ہو گی۔ دوسری جگہ ارشاد ہے لاغلبن انا و رسلی (۵۸/۲۱)۔ میں اور میرے پیغمبر ضرور غالب رہیں گے' خود حضور کے لئے ارشاد ہے۔ واللہ یعصمک من الناس (۵/۶۷)۔ اللہ تمہیں لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔ وحی اور نبوت کا سلسلہ حضور پر ختم ہو گیا۔ اس کے بعد وہ نظام آگے چلا جو قرآنی قوانین کے مطابق قائم کیا گیا تھا۔ اس نظام میں حضور کا جانشین وہ تمام فرائض و واجبات سرانجام دیتا تھا جنہیں حضور خود اپنی زندگی میں سرانجام دیتے تھے۔ جن میں سے چند مثالیں' مال غنیمت' مال فئے و اقامتِ صلوٰۃ کے بارے میں اوپر درج کی گئی ہیں اور جس کی چند مثالیں اور بھی پیش کر دی جائیں گی۔ اس سلسلہ میں غور طلب بات یہ ہے کہ حضور اپنے دور میں اپنے سربراہ مملکت کے منصب کے فرائض ادا کرنے میں جو انتظامی اقدامات لیتے تھے اور جو سنت کہلاتے ہیں' اس منصب کی اطاعت حضور پر ختم نہیں ہوتی بلکہ اس منصب کی اطاعت حضور کے بعد جاری رہی۔ اسی کو دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضور پر وحی و نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لیکن رسالت کا فریضہ امت کے سپرد ہوا اور جو امور حضور سربراہ مملکت کے منصب کی حیثیت سے کرتے تھے' وہ آپ کے جانشین ادا کرتے تھے۔ ہمارے علماء کرام نے حضور کی انتظامی و عقلی اطاعت کو (جو آپ کی زندگی تک محدود تھی) اس کو وحی قرار دے کر' اس کی اطاعت کو آپ کی احادیث کی اطاعت قرار

دے دیا۔ حالانکہ قرآنِ کریم کی رو سے حضور کی یہی انتظامی وعقلی اطاعت آپ کے خلفاء کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ جس کی تائید صاحبِ ''تدبر قرآن'' نے بھی فرمائی ہے' آپ کی یہ اطاعت وحی کی اطاعت نہیں تھی' بلکہ عقلی و انتظامی اطاعت تھی اور آپ کے بعد' اسے' از خود' آپ سے آپ' خلفاء اور حکام کی طرف منتقل ہو جاتا ہے' اسی وجہ سے قرآن کریم نے جس طرح آپ کی اطاعت کی تاکید فرمائی ہے' اسی طرح آپ کے خلفاء کی اطاعت کی بھی تاکید فرمائی ہے۔

قرآنِ کریم میں ہے کہ اگر میاں بیوی میں اختلافات واقع ہو جائیں تو حکومت کو لازم ہے کہ ان دونوں کی طرف سے ایک ایک حَکَم مقرر کر دے تاکہ وہ ان کے مابین مصالحت کرا دیں حکماً من اھلہ و حکماً من اھلھا (۲/۲۵)۔ ایک حکم شوہر کے خاندان سے اور ایک حکم بیوی کے خاندان سے۔ یہ دونوں حکم اپنی عقل و بصیرت کے مطابق ان دونوں میں صلح صفائی کرنے کی کوشش کریں۔ ان کے پاس کوئی وحی کا حکم نہیں ہو گا۔ حکومت ان حکموں کے ساتھ پورا پورا تعاون کرتی ہے۔ حکومت کا یہ انتظام حضور کے دور میں بھی تھا۔ خلافت راشدہ میں بھی تھا اور ہر اسلامی حکومت میں ہو گا۔ یہ انتظامی اطاعت منتقل ہوتی چلی جائے گی' کیونکہ یہ ایک منصب کی اطاعت ہے۔

جب دو مسلمان گروہوں یا حکومتوں میں اختلاف واقع ہو جائے تو قرآنی ہدایت کے مطابق ان میں صلح کرانا ضروری ہے۔ وان طائفتان من المومنین اقتتلوافا صلحوا بینھما (۴۹/۹)۔ یہ حکم حضور کے دور میں بھی انتظامی طور پر سرانجام دیا جاتا تھا اور اس کے بعد یہ حکم حضور کے جانشینوں کو ادا کرنا ہو گا۔

اس قسم کی بہت سی مثالیں پیش خدمتِ عالی کی جا سکتی ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور کی اطاعت میں اس دور کی انتظامی اطاعت بھی شامل تھی' اور وہ انتظامی اطاعت حضور کے جانشینوں کی طرف ازخود منتقل ہو جاتی ہے۔ ہمارے علماء کرام اس انتظامی اطاعت کے قائل نہیں وہ اس کو بھی مبنی بر وحی قرار دے کر' حدیث کی اطاعت میں تبدیل کر دیتے ہیں لیکن اطاعت کے لئے تو ہر جگہ' ہر وقت زندہ اتھارٹی کی ضرورت ہوتی ہے اور احادیث یہ Condition پوری نہیں کرتیں۔ اس موقف کی تائید میں ہمارے علماء کرام اطیعوا للہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم (۴/۵۹)۔ کی مشہور آیت پیش کرتے ہیں' اس آیت کا قرآنی مفہوم سابقہ مضامین میں بار بار واضح کیا جا چکا ہے اور آئندہ بھی حسب ضرورت پیش کر دیا جائے گا۔ اس وقت اس آیت

کی تفسیر میں ہمارے علماء کرام سے جو تسامح ہوا ہے' اس کا صرف وہ حصہ پیش کیا جاتا ہے' جس کا اس مضمون سے تعلق ہے۔

اس آیۂ کریمہ کا ترجمہ یقیناً آپ کے ذہن میں ہوگا۔ اگر نہیں ہے تو آپ قرآن کے نسخے سے ملاحظہ فرما لیں۔ ہمارے علماء کرام کے نزدیک عملاً اس کا ترجمہ یہ ہے اے ایمان والو' اطاعت کرو قرآن کی' اطاعت کرو احادیث کی اور اپنے میں سے حاکموں کی پھر اگر تمہارا جھگڑا ہو اور اس جھگڑے کو قرآن و حدیث کی طرف موڑ دو۔

اس ترجمہ کے پیش نظر یہ صورت ہوتی ہے کہ اگر راشد اور سلمان کے درمیان آپس میں کوئی تنازعہ پیش آیا' جس کا فیصلہ وہ خود قرآن و حدیث کی رو سے نہیں کر سکے یا اپنے اپنے مفاد کو ترجیح دینے کے باعث' کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکے۔ ایسی حالت میں قرآن کریم و کتب احادیث و روایات ان کا فیصلہ نہیں کرا سکیں گی۔ قرآنی حکم کے مطابق وہ اپنا تنازعہ اپنے وقت کے حکام کے پاس لے جائیں گے اس بات کا امکان ہے کہ وہ اس حاکم کے فیصلے پر بھی رضامند نہ ہوسکیں۔ اس صورت میں ہمارے علماء کرام کے موقف کے مطابق وہ اپنا رخ پھر قرآن و حدیث کی طرف کریں گے۔ اس طرح ہمارے علماء کرام ان کو قرآن و حدیث کی طرف دوبارہ لوٹا رہے ہیں۔ حالانکہ وہ نہ حاکم کے پاس جانے سے قبل قرآن و حدیث سے یہ تنازعہ دور کرا سکے تھے اور نہ اب کرا سکیں گے۔ یہ بات بالکل ظاہر و واضح ہے کہ اس طرح کے تنازعات طے کرانے کے لئے قرآن اور کتبِ احادیث' بلکہ کوئی قانون (کا مجموعہ) بھی زندہ حکام کے بغیر نہ پہلے فائدہ مند تھا اور نہ اب فائدہ مند ہوسکتا ہے۔ ہمارے علماء کرام کی روایتی تفسیر میں جو اصل اور بنیادی خامی ہے وہ یہی ہے کہ جس قانون Law کے ہوتے ہوئے انہیں اولی الامر کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی' اب اولی الامر کے بعد پھر ایسے اشخاص کا فیصلہ اسی قانون سے ٹھہرانا (جس سے وہ پہلے فیصلہ نہیں کرا سکے) بالکل غلط ہے۔ اس Procedure سے تو یہی باور ہوتا ہے کہ وہ دونوں پارٹیاں مسلسل برسر پیکار رہیں اور ان کا آخری فیصلہ کر دینے والا کوئی زندہ حاکم نہ ہو۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ آیۂ کریمہ (۴/۵۹) میں رسول سے مراد کتب روایات نہیں ہوسکتیں بلکہ زندہ رسول مراد ہے اور ان کے بعد ان کے خلفاء وحکمران و جانشین ورنہ اس آیت کا حکم (وفات رسول کے بعد) رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہی ختم ہوجائے گا۔

واللہ علی مانقول شہید۔

سورۃ الفاتحہ

(گذشتہ سے پیوستہ)

قرآنِ حکیم نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں ہی مدون شکل میں موجود تھا

برادرانِ عزیز! یہاں ایک اور نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرہ کے شروع میں کہہ دیا تھا کہ ذٰلِکَ الْـکِتٰب (2:2) یہ ایک ''کتاب'' ہے۔ عربوں کے ہاں کتاب کا لفظ اس وقت بولتے تھے جب ''منتشر اجزاء کی شیرازہ بندی کر کے ان میں لوہے کا کڑا (Iron Ring) پرو دیا جاتا تھا یا سلائی کر دی جاتی تھی''۔ قرآن کو الکتاب کہنے سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ صحیفۂ مقدسہ حضورِ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں ایک مرتبہ اور مدوّن کتاب کی شکل میں موجود تھا' جس کی شیرازہ بندی بھی ہو چکی تھی۔ سورۃ الطّور میں ہے کہ وَالطُّوْرِ o وَکِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ o فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (52:1-3) قرآن سطروں میں لکھی ہوئی کتاب تھی۔ پہلے اسے منتشر اوراق پر لکھا جاتا تھا اور بعد میں اس کی شیرازہ بندی کی جاتی تھی۔

عربوں کے ہاں ہرن کی کھال چھیل کر اسے (چرمی کاغذ) Parchment [1] کی شکل میں' قرطاس بنا لیتے۔ اسے رَقّ کہا جاتا تھا۔ جن تحریروں کو محفوظ رکھنا مقصود ہوتا' انہیں اس پر قلم بند کر لیتے تھے۔ جہاں تک کاتبینِ وحی کا تعلق ہے' سورۃ عبس میں ہے کہ قرآن کی کتابت بڑے باعزت اور قابلِ اعتماد کاتبوں نے کی تھی (80:15-16)۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ روایات جن میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں قرآن جمع اور مدوّن نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی تدوین بعد میں منتشر ٹھیکریوں' ہڈیوں اور پتوں کی مدد سے حضرت ابوبکر صدیق (632-634) یا حضرت عمر فاروق (634-645) یا حضرت عثمان غنی (645-656ء) کے زمانے میں ہوئی تھی' وضعی ہیں' جنہیں قرآن کی اہمیت اور خصوصیت کو نظروں سے گرانے کے لیے اختراع کیا گیا ہے۔ قرآن حضورؐ کے زمانے میں' حضورؐ کی زندگی میں ہی' اسی شکل میں مرتب' مدوّن' قرطاس پر موجود تھا' جس شکل میں آج ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔ اس میں ایک لفظ بھر کی کمی بیشی کہیں نہیں ہوئی۔ اسی مرتب اور مدوّن کتاب کے متعلق کہہ دیا گیا کہ یہ کتاب مکمل ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا: وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ط لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ ج (6:116)۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ خدا نے اسے نازل کیا ہے اور وہ خود اس کی حفاظت کا ذمے دار ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ (15:9)۔ خدا نے اس

---

[1] Parchment: بھیڑوں' بکریوں' میمنوں یا بچھڑوں کی کھال جسے اس طرح تیار کیا جائے کہ اس پر لکھا جا سکے۔ (حوالہ ڈاکٹر جمیل جالبی (مدیر): قومی انگریزی اردو لغت' مقتدرہ قومی زبان' اسلام آباد' 1992' ص1412) نیز.....

The skin of a sheep, or goat, prepared for writing or painting upon A written text. stiff, durable paper made in imitation of the material. Pergamum in Western Turkey (where it was first used as a substitute for Papyrus) (Ref. Reader`s Digest (1990) Universal aictionary. London: The Readers Digest Association Limited. pp.1124-1125)

کی تصریح فرما دی کہ قرآنِ کریم ایک مرتب کتاب کی شکل میں رسول اللہﷺ کے زمانے میں موجود تھا۔ یہ ہر طرح سے مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی اور یہ بھی کہ یہ قیامت تک کے لیے محفوظ رہے گا۔

ختمِ نبوت

برادرانِ عزیز! اس سے آپ' علاوہ دیگر امور' اس حقیقت کو بھی دیکھ لیں گے کہ قرآنِ کریم نے ختمِ نبوت کی حقیقت کو کس طرح واضح کر دیا ہے۔ جب ایک ایسا ضابطہ حیات ہو جو تمام نوعِ انسان کے لیے' قیامت تک کے لیے' مرتب اور محفوظ شکل میں دے دیا گیا ہو اور اس کے بعد اس میں کوئی تبدیلی بھی نہ کر سکتا ہو' تو ایسی کتاب کی موجودگی میں کسی نبی یا رسول کے آنے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ قرآن کی ابدّیت' اکملیّت' محفوظیّت اور عالمگیریّت خود ختمِ نبوت کی دلیل ہے۔ قرآن کی نص صریح کی رو سے کوئی نبی یا رسول بغیر کتاب کے نہیں آیا لہٰذا جب خدا کی طرف سے آخری کتاب دی جائے تو اس کا لانے والا خود بخود آخری رسول ہو جائے گا۔ اس لیے نبی اکرمﷺ خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں اور اس کی کتاب آخری کتاب ہے جو قیامت تک کے لیے محفوظ ہے۔

قرآنِ حکیم کے لیے عربی زبان کی خصوصیات کی وضاحت

اب آیئے قرآن کریم کی زبان کے متعلق۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں کہا ہے کہ یہ کتاب بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ (26:195) ہے۔ یعنی اس کتاب کی زبان عربی مبین ہے اور دیگر مقامات پر بھی اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ یہ کتاب عربی مبین میں نازل ہوئی ہے۔ خود لفظ عربی کے معنی بھی ''فصیح اور واضح کے ہیں'' اور جب اس کے ساتھ ''مبین'' کا اضافہ کر دیا جائے تو اس کے واضح تر ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔ یہ کتاب واضح ہے اور غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ (39:28) ہے' یعنی اس میں کوئی پیچ وخم نہیں' ابہام نہیں' التباس نہیں: صاف' نکھری' سیدھی' واضح' کتابِ روشن' حتیٰ کہ قرآن کو نور بھی کہا گیا ہے' یعنی خود روشن اور دنیا کو روشن کرنے والی کتاب۔ جس طرح روشنی اپنے وجود کو یا اپنے آپ کو دکھانے کے لیے کسی اور روشنی کی محتاج نہیں ہوتی' اسی طرح قرآنِ کریم بھی اپنے مطالب ومفاہیم واقدار واصول وپیغام وتعلیم کو واضح کرنے کے لیے کسی خارجی روشنی کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی وضاحت ذرا آگے چل کر آئے گی۔

قرآنِ حکیم صرف اپنے الفاظ میں ہی قرآنِ حکیم ہے

جہاں تک عربی زبان کا تعلق ہے' قرآنِ کریم کی زبان اس کے علاوہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی تھی' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اصول یہ بتایا ہے کہ جس قوم کی طرف کوئی رسول بھیجا جاتا ہے' اُس رسول کا پیغام' اُسی قوم کی زبان میں ہوتا ہے۔ چونکہ رسول اللہﷺ کے اوّلیں مخاطب عرب تھے اس لیے قرآنِ کریم انہی کی زبان میں آیا اور انہی کی زبان میں آنا چاہیے تھا لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مشیت کے

پروگرام میں کچھ ایسا تھا کہ وہ زبان جس میں قرآن نازل ہونا تھا' ایسی جامع' عمیق اور وسیع ہو کہ وہ قرآنی حقائق کی متحمل ہو سکے۔ علم الالسنہ کے ماہر بتاتے ہیں کہ اس باب میں دنیا کی کوئی زبان عربی زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

جب حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو ذبح کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے تو خدا نے انہیں بیٹے کے حلق پر چھری چلانے سے روک دیا اور کہا کہ ہم اسے ایک عظیم قربانی کے لیے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ حضرت اسماعیلؑ حضرت ابراہیمؑ کے بڑے بیٹے تھے اور باپ کی مملکتِ عظیم کا انہی کو وارث ہونا تھا لیکن حکم یہ دیا گیا کہ انہیں حجاز کی وادیٔ غیر ذی زرع میں بسایا جائے۔ غیر ذی زرع کہ جہاں کچھ اگتا ہی نہیں' جہاں کچھ ہوتا ہی نہیں۔ کہا کہ انہیں اس وادی میں بسایا جائے تا کہ یہ وہاں خانۂ خدا کی تولیت کا فریضہ سرانجام دیں اور مملکتِ شام کی سرداری حضرت اسحاقؑ کو دے دی جائے۔ اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت اسحاقؑ کی اولاد بنی اسرائیل' امورِ جہاں بانی میں مصروف رہی۔ اس کے حصے میں شوکتِ سلیمانی اور سطوتِ داؤدی آئی' لیکن بنی اسماعیل اسی وادیٔ غیر ذی زرع میں نہایت سادہ زندگی بسر کرتے رہے۔ انہوں نے نہ کوئی حکومت قائم کی اور نہ ہی کسی تہذیب وتمدن کی بنا ڈالی' یہ ایک ہی کام کرتے رہے یعنی عربی زبان کی تشکیل' تعمیر اور تہذیب۔ انہوں نے اس زبان کو اس مقام پر پہنچا دیا کہ دنیا کی کوئی زبان اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی۔

یہ ہمارا عقیدت مندانہ دعویٰ ہی نہیں بلکہ دنیا کے محققین پوری تحقیق وتفتیش کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ ڈاکٹر بک [1] (Dr. Bucke) نے اپنی مشہور کتاب Cosmic Consciousness میں مشہور مستشرق Max Muller کی تحقیقات کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''جس زمانے میں تمام انڈو یورپین زبانوں (Indo-European languages) میں مادی تصورات (Root Concepts) کی تعداد ایک سو اکیس (121) تک پہنچ پائی تھی' عربوں کے ہاں صرف اونٹ کے تضمنات میں پانچ ہزار سات سو چوالیس (5744) الفاظ موجود تھے۔ سوچیے' اس سے اس زبان کی وسعتوں کا اندازہ لگ سکتا ہے۔

عربی زبان کے مادوں کی تعداد 25 ہزار کے قریب ہے

عزیزانِ من! یہ عربی زبان بڑی سائنٹفک زبان ہے۔ اس میں ایک مادہ یعنی Root ہوتا ہے جو عام طور پر تین حرفوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس مادے کے معانی میں ایک بنیادی خصوصیت ہوتی ہے' جو ان تمام الفاظ میں جھلکتی چلی جاتی ہے' جو اس مادے سے مختلف ابواب میں بنائے جاتے ہیں۔ ان مادوں کی تعداد پچیس ہزار (25000) کے قریب ہے۔ آپ اندازہ لگا لیجیے کہ ان مادوں سے جو الفاظ بنائے گئے ہوں گے' ان کی تعداد کس قدر ہو گی' اور پھر اس میں دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مختلف ابواب ہیں' اوزان ہیں' ہر باب کی ایک الگ خصوصیت ہوتی ہے۔ یعنی ایک مادہ یا Root ہے' جس کی ایک متعین خصوصیت ہے۔ وہ

---

[1] Richard maurice Bucke.

خصوصیت ہر اس لفظ میں پائی جائے گی جو اس Root (مادہ) سے بنے اور پھر وہ الفاظ ان ابواب کے مطابق بنیں گے اور ہر باب کی ایک الگ خصوصیت ہوگی۔ اس لیے جو لفظ بھی آپ کے سامنے آئے، اس کے باب کو دیکھیے۔ اور اس کے Root (مادہ) کو دیکھیے۔ ان دونوں کو ملانے سے اس کا ایک متعین مفہوم آپ کے سامنے آ جائے گا۔ یہاں تک کہ یہ ترتیب اس مادے میں فلاں اور فلاں حرف اکٹھا آئے تو اس کی یہ خصوصیت ہوگی، یعنی جتنے بھی Roots (مادے) ایسے ہوں گے جن میں وہ دو حرف آ جائیں ان میں وہی خصوصیت ہوگی، جو ان دو حرفوں کے اکٹھے ہونے سے بتائی گئی ہے۔ اندازہ لگایئے کہ دنیا کی کوئی زبان بھی ایسی ہے جو اس کا مقابلہ کر سکتی ہو۔ یہ تھی وہ زبان جس میں قرآن نازل ہوا۔ ❶

قرآنِ حکیم کی عربی زبان آسان ترین بھی ہے اور نہایت عمیق و وسیع بھی

پہلے تو یہی بات یہاں سے سمجھ میں آتی ہے کہ یہ زبان بڑی سائنٹیفک (Scientific) واقع ہوئی ہے۔ اس لیے اس کا سمجھنا بڑا آسان ہے۔ یہ جو اس زبان کو ہوّا بنا کر رکھ دیا گیا ہے تو یہ بھی ایک سازش ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ عام مسلمان قرآن کو براہِ راست سمجھنے نہ لگ جائے اور یہ خاص طبقے کی اجارہ داری رہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اگر آپ میں سے کسی نے عربی ادب پر حاوی ہونا ہو، تو وہ واقعی بڑی محنت بھی چاہتا ہے، بڑی وسعت و معلومات چاہتا ہے، تعلیم میں بھی بہت آگے بڑھنا پڑھتا ہے لیکن قرآنِ کریم تو اس قدر آسان عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے یعنی عجیب چیز ہے کہ زبان کے اعتبار سے اتنا جامع، اتنا وسیع، اتنا عمیق اور سمجھنے کے اعتبار سے اس قدر آسان! خود اس کا دعویٰ ہے کہ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ (54:16) یہ حقیقت ہے کہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے بڑا آسان بنایا ہے۔ دوسری جگہ ہے کہ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (41:3) یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات کو نکھار کر، الگ الگ کر کے، واضح طور پر، بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ قرآن اُن لوگوں کے لیے جو علم و بصیرت سے کام لیں، ایک واضح ضابطہ حیات بن گیا۔ یہ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (16:89) ہے یعنی جن امور کا ذکر اس میں کیا گیا ہے، انہیں بڑی وضاحت سے کھول کر بیان کیا گیا ہے۔

ان تصریحات سے ایک بات واضح طور پر سامنے آ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے سمجھنے کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ اس میں جو الفاظ آئے ہیں، پہلے Roots ❶ یا مادہ کی روح سے ان کے معانی متعین کیے جائیں اور پھر یہ دیکھا جائے کہ زمانہ نزول قرآن میں ان الفاظ کے معانی کیا لیے جاتے تھے۔ ایک لفظ کے Shape (شکل و ساخت) کے اعتبار سے کئی ایک معانی یا مفہوم

---

❶ ان نکات کی مزید تشریح و تبیین کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورۃ انبیاء، ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005، ص ص 21-20، بالخصوص انہی صفحات کے فٹ نوٹ (1,2)20 اور (3-4)21۔

ہوتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ جس زمانے میں قرآنِ کریم نازل ہوا تھا عرب اس کے کیا معنی لیتے تھے۔

ہزار سال سے مرتب کی جانے والی لغات کی ایک بنیادی کمزوری

برادرانِ عزیز! قرآنِ کریم کا مفہوم اُسی صورت میں سمجھ میں آ سکتا ہے جب پہلے یہ معلوم ہو کہ زمانہ نزول قرآن میں عرب ان الفاظ کا جو قرآنِ کریم میں آئے ہیں کیا مطلب یا معنی لیا کرتے تھے۔ قرآنِ کریم کے متعلق ہمارے ہاں اس ہزار سال میں اس قدر لکھا گیا ہے کہ اس سے کمروں کے کمرے بھر جائیں لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ قرآنِ مجید کا کوئی لغت ایسا نہیں جو اس انداز سے مرتب کیا گیا ہو۔ یعنی جو چیز قرآن کے سمجھنے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے' وہ چیز ہمارے ہاں کے اس لٹریچر میں کبھی مرتب ہی نہیں ہوئی۔ لے دے کر ایک امام راغب اصفہانی ❶ (متوفی قریب 502ھ) کی لغت ہے' جسے المفردات فی غریب القرآن کہتے ہیں لیکن وہ بڑا مختصر سا لغت ہے۔ وہ اس نہج پر مرتب نہیں کیا گیا جس کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے۔ ❷

لغت کے مرتب کرنے میں میری سعی وکاوش

قرآنِ کریم کا صحیح مفہوم سمجھنے کے راستے میں میری سب سے بڑی اور پہلی دشواری بھی یہی اسی قسم کے لغت کا فقدان تھا۔ لہٰذا میرے لیے ایسا لغت مرتب کرنا یوں کہیے کہ میرے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ تنہا بے ساز و سامان کوئی رفیقِ کار نہیں' کوئی جماعت نہیں اور پھر غالباً آپ احباب کو اس کا علم ہوگا کہ میں مرکزی حکومتِ ہند میں ملازم بھی تھا لیکن چونکہ مجھے قرآنِ کریم کے ساتھ عشق تھا اور عشق اس قسم کی خارا شگافیوں کو آسان بنا دیا کرتا ہے۔ میں نے اللہ کا نام لے کر اس قسم کے لغت مرتب کرنے کا کام شروع کر دیا۔ ❷ اللہ تعالیٰ کا یہ فضل وکرم سمجھیے کہ میں برسہا برس کی محنت شاقہ کے بعد اس میں کامیاب ہوا اور میرا یہ لغت چار جلدوں میں چھپ کر شائع ہو چکا ہے اور بڑا ہی مقبول ہوا ہے کیونکہ یہ اپنے انداز کی منفرد ڈکشنری یا لغت ہے' جس کا کہیں دوسرا جواب نہیں ملتا۔ اس پر میں بدرگاہِ رب العزت جس قدر بھی سجداتِ شکرانہ ادا کروں' کم ہیں۔ اس لغت کی مدد سے قرآنِ کریم کے الفاظ کے صحیح معانی

---

❶ Imam Raghib AL-Isphahani of Persia (1327-1409A.D) (He was) beheaded. (Re. Some Quranic Voices by Shabbir Ahmed, M.D. Florida, USA, Through Website sent on Saturday, April 01, 2006, 6:03pm on the Subject. 2: Analysis of Criticism Against Quran upholders (Questions/Answers): Website Islamdawn.

❷ مزید لغت کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ طٰہٰ' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور 2005ء' ص ص 55-154 اور انہی صفحات کا فٹ نوٹ 2۔

تو متعین ہو گئے۔ بظاہر یہ نظر آئے گا کہ اس کے بعد قرآنِ کریم کی آیات کا ترجمہ کرنا بہت آسان ہو جائے گا یا بہت آسان تھا لیکن یہاں ایک اور دشواری شروع ہوئی۔

الفاظ کے معنی تو یہ کیے لیکن قرآنِ کریم تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وحی کردہ کتاب ہے اور اس کے تو اعجاز ہی اس قسم کے ہیں کہ انسان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ بالآخر یہ کتاب کس انداز سے مرتب ہوئی ہے۔ اس کا انداز گرانقدر معجزانہ ہے۔ اس میں اس کے خاص اسلوب کو بنیادی دخل ہے۔ اس کی آیتوں کے اندر جو الفاظ آئے ہیں' ان کی ترتیب اور ترکیب تو کچھ اس انداز کی ہے کہ ان کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ بات میں محض اعتقاد کی بنا پر نہیں کہہ رہا بلکہ یہ وہ حقیقت ہے جسے ہم تو ایک طرف' مغرب کے بڑے بڑے مستشرقین' جو عربی زبان کے فاضل ہیں' وہ بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس کی زبان کا اسلوبِ بیان اس قسم کا ہے کہ اس کا ترجمہ دنیا کی کسی زبان میں ہو نہیں سکتا۔ H.A.R Gibb عربی زبان کا بہت بڑا فاضل ہے۔ اس کی ایک کتاب Modern Trends In Islam (اسلام میں جدید رجحانات) ہے۔ اس کا 1945 کا ایڈیشن میرے سامنے ہے۔ وہ اس کتاب میں لکھتا ہے کہ ''حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا..... جس طرح کسی بلند شاعری کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ وحی کی زبان ہی مختلف ہوتی ہے..... قرآنِ کریم کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرو تو اس سے زیادہ کیا ہو گا کہ اس کے عربی زبان کے تراشے ہوئے نگینوں کے گوشوں کو جامع طور پر سامنے لانے کے بجائے' مترجم اپنے وضعکردہ ایسے الفاظ استعمال کرے گا جو اصلی الفاظ کی وسعت اور جامعیّت کو مقید کر دیں گے۔ ایسی آیات میں' جن میں عام واقعات یا قوانین و احکام مذکور ہوں' ترجمہ کا یہ نقص شاید زیادہ نقصان رساں نہ ہو لیکن' بایں ہمہ' جو مدوجزر' جو نشیب و فراز' جو بلندیاں اور گہرائیاں' جو لطافتیں اور باریکیاں' اور اس کے ساتھ جو جوش و خروش' اصل کتاب میں جلوہ فرما ہے' وہ ترجمہ میں کیا آ سکے گا! ذرا اس صاف اور سیدھی سی آیت کو لیجیے: اِنَّا نَحْنُ نُحْیٖ وَنُمِیْتُ وَاِلَیْنَا الْمَصِیْرُ (50:43) اور انگریزی ہی نہیں' دنیا کی کسی زبان میں اس کا ترجمہ کر کے دکھایئے۔ اس کے چھ الفاظ میں' جو پانچ مرتبہ ''ہم (We)'' کی تکرار ہے' اسے کون سی زبان ادا کر سکے گی؟''

قرآن حکیم کے ترجمہ کی بجائے اس کا مفہوم بیان کرنے کی طرح ڈالی گئی

عزیزانِ من! قرآنِ کریم کے الفاظ کے معانی متعین کرنے کے بعد بھی اس کی آیات کا ترجمہ کرنا میرے لیے کیا' کسی کے بھی بس میں نہ تھا۔ لہٰذا میں نے ترجمے کے بجائے قرآنِ کریم کا مفہوم لکھا۔ اس کا نام ہے ''مفہوم القرآن''۔ میرا یہ ''مفہوم القرآن'' اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے الحمد سے والناس تک مسلسل تیس پاروں کا مفہوم ہے۔ اور وہ نہایت حسن و خوبی سے شائع ہو چکا ہے۔ اسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے' وہ متفقہ طور پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس سے

قرآنِ کریم کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں رہتی۔

قرآنِ حکیم کی وضاحتوں کے بارے میں ارشادِ خداوندی

یہ کچھ تو قرآنِ کریم کی آیات کے مفہوم کے متعلق تھا جب کہ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم کا ایک اور اہم باب بھی ہے جو اس نازل کرنے والے خدا نے کہا ہے کہ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (75:19) قرآن کی وضاحت خود ہمارے ذمے ہے۔ اس کے لیے طریق کیا اختیار کیا گیا ہے' یہ بات غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔ قرآن کا انداز عام کتابوں جیسا نہیں۔ عام کتابوں کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اس میں وہ کتاب مختلف ابواب میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔ ہر باب کا ایک خاص موضوع ہوتا ہے اور اس موضوع سے متعلق تعلیم اس باب کے تحت مربوط طور پر دے دی جاتی ہے یعنی جب ایک باب ختم ہوتا ہے تو جو کچھ اس موضوع کے متعلق کہنا مطلوب و مقصود ہے' وہ اس باب کے اندر آ جاتا ہے۔ قرآن اس طرح کی تصنیف کردہ کتاب نہیں۔ یہ یوں سمجھیے کہ جیسے تیئیس سال میں عطا فرمودہ مختلف خطبات کا مجموعہ ہو۔ اس میں ایک بات ایک مقام پر آئی ہے۔ اس کی مزید وضاحت دوسرے مقام پر ہے' تفسیر کسی اور جگہ ہے' استثناء کسی اور سورت میں ہے۔ نیز مختلف حقائق کو مختلف واقعات کے ضمن میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ اسے تصریفِ آیات سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی آیات کو پھیر پھیر کر لانا۔ سورۂ انعام میں ہے کہ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (6:105)۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن میں مختلف آیات کو پھیر پھیر کر اس لیے لایا گیا ہے کہ بات اس طرح واضح ہو جائے جیسے چھلکا اور مغز الگ ہو جاتے ہیں اور یوں بات نکھر اور ابھر کر سامنے آ جائے۔ اس کے بعد یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے سمجھنے کے لیے دو بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک محاورۂ عرب یعنی نزولِ قرآن کے زمانے میں عربی زبان کے ان الفاظ کا جو قرآن میں استعمال ہوئے ہیں' وہ مفہوم' جو عرب لیتے تھے' اس سے واقفیت۔ دوسری بات قرآنِ کریم پر اتنا عبور ہو کہ جو بات کسی ایک آیت میں کہی گئی ہے یہ چیز بیک وقت آپ کے سامنے آ جائے کہ اس کے متعلق قرآن کے دیگر مقامات میں کیا آیا ہے۔

قرآنِ حکیم کے انسائکلو پیڈیا یا تبویب کی اہمیت اور اس کی تیاری کا مرحلہ

جس طرح قرآنِ کریم کے الفاظ کے متعلق بیان کیا گیا ہے' اس قسم کا بھی کوئی لغت پہلے سے موجود نہیں تھا۔ قرآنِ کریم کے اس انداز کو آپ انسائیکلو پیڈیا کہیے کہ عربی زبان میں اسے تبویب [1] کہتے ہیں' یعنی باب کرنا قرآنِ کریم کے متعلق اس قسم کی بھی کوئی کتاب اس سے پہلے موجود نہیں تھی' یعنی ایسی کتاب جو ہر اس موضوع کے متعلق بیک وقت بتا دے جو آپ کے ذہن میں آئے کہ قرآنِ کریم

---

[1] قرآنی موضوعات کو تبویب کی شکل میں پیش کرنے کے موضوع کے متعلق مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء' ص ص 170 تا 171۔

میں یہ موضوع کس کس مقام میں آیا ہے' اس کے متعلق کیا کیا آیا ہے' وضاحت کہاں ہے' اضافہ کہاں ہے' استثنا کہاں ہے' تشریح مزید کہاں ہے' براہِ راست یہ کچھ کہاں کہاں کہا گیا ہے یا کسی واقعہ کے ضمن میں یہ کچھ کس کس جگہ ہے۔ یہ تمام چیزیں بیک وقت سامنے آ جائیں اور غور فرمایئے عزیزانِ من! کہ یہ مرحلہ پہلے سے بھی زیادہ دشوار گزار اور محنت طلب تھا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر اس تبویب یا انسائیکلو پیڈیا کا بھی آغاز کر دیا اور اس کے فضل و کرم سے اس میں اس طرح کامیاب ہوا کہ میری تبویب القرآن' قریباً دو ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی یہ کتاب شائع ہو کر بڑی ہی مقبول ہو چکی ہے۔ [1]

اب آپ سوچ لیجیے کہ قرآنِ کریم کے سمجھنے کے لیے جو کچھ میں نے کیا ہے' وہ کس قدر محنت طلب مرحلہ تھا۔ پہلے جس انداز سے سمجھا اور پھر اس کو سمجھانے کا جو انداز ہے' اس کے لیے لغات القرآن ہے یہ لغات القرآن صرف قرآنِ کریم کے الفاظ کے وہ معانی بتاتا ہے' جو زمانہ نزولِ قرآن میں عرب لیتے تھے' پھر ان معانی کی رو سے سارے کے سارے قرآن کا مفہوم مرتب کیا اور قرآن کے موضوعات کے متعلق اس قسم کی تبویب کا انسائیکلو پیڈیا ترتیب دیا کہ جو موضوع آپ کے سامنے آئے' آپ کو بیک وقت معلوم ہو کہ قرآن میں اس کے متعلق کیا کیا آیا ہے۔ ان چیزوں کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کو صحیح طور پر سمجھنے کی کسی اور چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

قرآنِ حکیم پر غور و فکر کی شرط ہر دَور کے لیے لازم ہے

عزیزانِ من! ان دونوں شرطوں سے زیادہ اہم ایک اور شرط بھی ہے اور وہ ہے تدبر فی القرآن (4:82) یعنی قرآنِ کریم کے سمجھنے میں غور و فکر سے کام لینا۔ آپ قرآنِ کریم کے ورق الٹیے' قریب قریب ہر صفحہ پر آپ کو علم و بصیرت اور عقل و شعور سے کام لینے اور غور و فکر کرنے کی تاکید ملے گی۔ تدبر کا حکم نہ کسی خاص فرد کے لیے ہے' نہ کسی خاص زمانے کے لیے ہے' وہ تمام افراد کے لیے اور تمام زمانوں کے لیے ہے۔ اس لیے قرآن کو تقلیداً سمجھا ہی نہیں جا سکتا' نہ ہی کسی ایک فرد کا تدبر و تفکر دوسرے کے لیے سند اور حجت ہو سکتا ہے۔ یعنی اس طرح سے نہیں ہے کہ کسی خاص زمانے میں' کسی خاص فرد نے' جو قرآنِ مجید کی کوئی تفسیر لکھ لی' وہی ہمارے لیے بھی کافی ہو گئی۔ ایسا نہیں ہے۔ یہ ہر زمانے کے مسلمان کو' ہر زمانے کے انسان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ خود قرآنِ کریم پر غور و فکر کرے۔ اس لیے کسی ایک فرد کا تدبر اور تفکر دوسرے کے لیے سند اور حجت نہیں ہو سکتا۔

---

[1] ان کی مزید تشریح و وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان انتیسواں پارہ' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006ء

قرآنِ حکیم سے استفادہ کرنے والے کے لیے وقت کے تقاضوں سے آگاہ ہونا بھی ضروری ہوگا

قرآنِ کریم پر غور کرنے والے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے زمانے میں جس سطح تک علمِ انسانی پہنچ چکا ہے' اس پر اس کی نگاہ ہو۔ قرآن انسانی زندگی کے تقاضوں کا حل پیش کرتا ہے۔ اگر کسی کو یہ ہی معلوم نہ ہو کہ اس کے زمانے کے انسانی تقاضے کیا ہیں' تو وہ قرآن سے کیا رہنمائی حاصل کر سکے گا۔ اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ جس طرح ایک فرد کا تدبر فی القرآن دوسرے کے لیے سند اور حجت نہیں ہوسکتا' اسی طرح جو کچھ قرآن کے متعلق کسی ایک زمانے میں سمجھا گیا ہو' وہ بھی حرفِ آخر نہیں ہوسکتا۔ جوں جوں علمِ انسانی بڑھتا جائے گا' نت نئے قرآنی حقائق واضح ہوتے چلے جائیں گے۔

قرآنِ حکیم کی کسی بات میں بھی تضاد نہیں ہے

اب آگے چلیے۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ط وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (4:82) کیا ان لوگوں نے قرآن میں تدبر نہیں کیا؟ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ لوگ اس میں کئی اختلاف پاتے۔ یعنی قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں کہیں اختلاف نہیں اور یہ چیز اس کے من جانب اللہ ہونے کی ایک دلیل ہے۔ ہمارے ہاں عام طور کہا جاتا ہے کہ قرآن کے الفاظ میں تو کوئی اختلاف نہیں یعنی جتنے بھی قرآن کے نسخے ہیں' ان میں متن (Text) ایک ہی جیسا ہے' اس میں کوئی اختلاف کی بات نہیں' کوئی اختلافی چیز نہیں۔ سب جگہ یہی الفاظ ہیں کہ اس میں تو کوئی اختلاف نہیں لیکن اس کی تعبیرات (Interpretations) مختلف ہوسکتی ہیں۔ آپ سوچیے کہ لفظی اختلافات کا نہ ہونا بھی کوئی ایسی خصوصیت ہے جس کا اس تحدی سے ذکر کیا جاتا؟ بات تو ساری تعبیرات کی ہے۔ اگر کسی کتاب کی عبارت کی کیفیت یہ ہو کہ وہ زید کو کوئی مفہوم دے اور بکر کو اس کے بالکل متضاد مفہوم' تو کیا اہلِ علم کے نزدیک اس کتاب کی کوئی وقعت ہوسکتی ہے؟ یاد رکھیے! قرآنِ حکیم کی کسی بات میں بھی تضاد نہیں ہے۔

قرآن حکیم پر تدبر مشروط ہوگا

قرآن سمجھنے کے لیے جو شرائط خود قرآن نے مقرر کی ہیں' اگر ان کے مطابق قرآن میں تدبر کیا جائے' تو اس کے کسی حکم کی دو تعبیرات (Interpretations) ہو ہی نہیں سکتیں۔ اس لیے اگر امت قرآن کو اپنی سمجھ اور حجت اور آخری دلیل تسلیم کر لے' تو امت

میں کسی قسم کا تفرقہ اور اختلاف پیدا ہی نہیں ہوسکتا؟

اس مقام پر ایک نکتے کی وضاحت ضروری ہے۔ قرآنِ کریم میں کچھ تو احکام وقوانین دیئے گئے ہیں اور کچھ حقائق۔ احکام وقوانین کے لیے ایسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، جن کے معانی متعین اور ٹھوس (Concrete) ہیں لیکن حقائق بالخصوص وہ حقائق، جن کا تعلق مابعد الطبیعات (Meta -Physics) سے ہے، انہیں تشبیہات کے انداز میں بیان کیا گیا ہے اور اہلِ علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ تشبیہات واستعارات سے ہر شخص اپنے اپنے فہم اور علمی سطح کے مطابق مشبہ بہ کے متعلق تصور قائم کرسکتا ہے۔ ان تصورات میں اختلاف ہوگا لیکن جہاں تک قرآنی ہدایت کا تعلق ہے، ان کی دو تعبیریں نہیں ہوسکتیں۔ یہ احکام وقوانین اسلامی نظام کی طرف سے نازل ہوں گے، اس لیے ان کی عملی جزئیات میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔ یوں امت میں وحدت فی العمل پیدا ہوجائے گی اور قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لیے فکری آزادی بھی قائم رہے گی۔

قرآن فہمی کے سلسلہ میں شرط اول قلب ونگاہ کی بالیدگی ہے

عزیز برادران! ان تمام شرائط سے کہیں زیادہ گہری شرط ایک اور ہے اور وہ یہ ہے کہ جب تک اپنے ذہن کو پہلے سے قائم شدہ نظریات، معتقدات اور تصورات سے پاک نہیں کرلیا جائے گا، قرآن سمجھ میں نہیں آسکے گا۔ لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (56:79) قرآنِ کریم کا واضح ارشاد ہے۔ یعنی ''جس کے قلب ونگاہ انسانی خیالات کی آمیزشوں سے پاک نہ ہوں، اسے قرآن سے کوئی مس نہیں ہوسکتا۔ انسانی قلب خدا کا مسکن بن نہیں سکتا جب تک اس حریم کعبہ سے انسانی فکر کے تراشیدہ بتوں کو نکال باہر نہ کیا جائے۔ جو شخص پہلے سے کوئی خیال قائم کرکے قرآن کی طرف اس لیے آتا ہے کہ اسے اپنے اس خیال کی کسی نہ کسی طرح تائید مل جائے، تو اسے قرآن کی بارگاہ سے بُری طرح پھٹکار پڑتی ہے۔ مفکر قرآن اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں:

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے!

قرآن فہمی کے سلسلہ میں اہل عرب کی کیفیت اور ہماری تقلید پرستی

دماغ کو پہلے ان بتوں سے پاک کرنا چاہیے اور پھر دیکھیے کہ قرآنِ کریم کس طرح جلوہ پیرا ہوکر اس میں داخل ہوتا ہے! بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ اہلِ عرب کی زبان تو عربی ہے۔ وہ بھی قرآن کو صحیح طور پر کیوں نہیں سمجھ پاتے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بھی قرآن کو غیر عرب مسلمانوں کی طرح تقلیداً سمجھتے ہیں یعنی کسی زمانے میں، کسی شخص نے، جس طرح قرآن کو سمجھا اور وہ آنے والوں کے لیے

سند اور حجت بن گیا۔ اس کے بعد یہ سوال ہی نہ رہا کہ قرآنِ کریم میں خود غور وفکر کیا جائے۔ یہ تقلیدی قرآن عربوں کو عربی زبان میں پڑھایا جاتا ہے اور غیر عربوں کو ترجموں کے ذریعے ان کی اپنی زبان میں۔ اپنی فکر سے نہ یہ قرآن کو سمجھتے ہیں' نہ وہ۔ اس لیے اس باب میں عرب اور عجم کی بھی کوئی تفریق نہیں رہی۔ تفسیر کی جو کتابیں الازہر میں پڑھائی جاتی ہیں' وہی دیو بند یا اب کراچی ملتان اور لاہور کے دارالعلوموں میں زیرِ تدریس رہتی ہیں۔ اپنی فکر و بصیرت نہ یہاں ہے' نہ وہاں۔

قرآنی رموز کو جاننے اور سمجھنے میں صدیوں سے حائل رکاوٹ

قرآن سمجھنے کے لیے سوال اہلِ زبان ہونے کا نہیں ہے۔ سوال زبان دانی کے بعد اہلِ فکر ونظر ہونے کا ہے۔ اپنے غور وفکر اور علم وبصیرت کی رو سے قرآنِ کریم کو سمجھنے میں ایک بہت بڑی دشواری حائل ہوتی ہے۔ ہمارے اسلاف نے یعنی متقدمین نے جو تفسیریں لکھیں' اگر وہ ان کے متعلق یہ کہتے کہ یہ ان کا اپنا خیال ہے' اپنی رائے ہے' اپنا فہم ہے' تو ان سے اختلاف کی گنجائش ہو سکتی تھی۔ ایک انسان کے خیال سے دوسرا انسان اختلاف کر سکتا ہے۔ اس میں نہ کوئی گناہ کی بات ہے' نہ جرم کی بات لیکن ہوا یہ کہ انہوں نے جو تفسیر لکھی تو اس کے متعلق یہ کہا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی بتائی ہوئی تفسیر ہے۔ ہمارے ہاں سب سے پہلی قرآنِ کریم کی تفسیر امام طبریؒ [1] کی تفسیر کہلاتی ہے۔ وہ بھی نبی اکرم ﷺ کی وفات کے دواڑھائی سو سال بعد تیسری صدی ہجری میں ہوئے ہیں۔ یہ پہلی مفصل قرآن کی تفسیر سمجھی جاتی ہے۔ پھر انہوں نے کیا یہ ہے کہ ہر آیت کی تفسیر کے متعلق لکھا یہ ہے کہ یہ نبی اکرم ﷺ کی بیان فرمودہ تفسیر ہے۔ تب ہوا یہ کہ وہ طبری کی تفسیر نبی اکرم ﷺ کی ارشاد فرمودہ تفسیر قرار پا گئی اور اس کے بعد آپ سوچیے کہ کس کی جرأت ہے کہ اس سے اختلاف کر سکے۔ جس تفسیر کے متعلق کہا جائے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی ارشاد فرمودہ ہے' تو پھر وہ کون مسلمان ہے جو اس کے خلاف کوئی ایک لفظ بھی کہہ سکنے کی جرأت کر سکے۔ چنانچہ اس کے بعد آج تک جتنی تفسیریں لکھی گئیں' ان میں الفاظ کا فرق ہوگا' اندازِ بیان کا فرق ہو گا' اسلوب کا فرق ہوگا' تفصیل کا فرق ہوگا لیکن بنیادی طور پر معنویت کے اعتبار سے اس سے کوئی اختلاف نہ کر سکتا تھا' نہ کسی نے کیا ہے۔

امام طبریؒ اور امام بخاریؒ کی محنت کے ماحصل کا نتیجہ

یہ ساری تفسیریں جو ہزار سال کے زمانے میں لکھی گئی ہیں' یوں کہیے کہ امام طبریؒ کی تفسیر پر طرحی غزلیں ہیں' لیکن میں ابھی

---

[1] ان نکات کی وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004ء' ص ص 30 تا 31 نیز فٹ نوٹ 1

عرض کروں گا کہ وہ جو آیات کی تفسیر انہوں نے لکھی ہیں' وہ نبی اکرم ﷺ کی نہیں ہیں' وہ روایات پر مبنی ہیں اور روایات کے متعلق میں ابھی عرض کروں گا کہ وہ کس طرح سے وجود میں آئیں اور ان کے متعلق کوئی شخص بھی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ وہ فی الواقع نبی اکرم ﷺ کی ہیں۔ صورت تو یہ ہوئی لیکن اس سے امت کو جو نقصان پہنچا' وہ یہ ہے کہ ہزار سال پہلے طبرستان کے رہنے والے ایک امام طبریؒ تھے اور دوسرے امام بخاریؒ (260-194ھ)' وہ بھی بخارا کے ہی رہنے والے تھے۔ انہوں نے حدیث کا مجموعہ مرتب کیا اور امام طبری نے پہلی تفسیر مرتب کر دی۔ دونوں روایات پر مبنی ہیں' دونوں میں سے کسی کے متعلق بھی یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی ہیں۔

طبری کی تفسیر کے متعلق اختلاف کی ذرا سی گنجائش نکل سکتی تھی اگر نبی اکرم ﷺ کے زمانے کی صحیح' یقینی تاریخ ہمارے پاس موجود ہوتی' لیکن وہ بھی ہمارے پاس نہیں ہے۔ امام طبریؒ نے جہاں قرآن کی تفسیر لکھی' وہیں اس زمانے کی تاریخ بھی لکھ دی: تفسیر تیس جلدوں میں' تاریخ تیرہ جلدوں کے اندر اور اس میں بھی ایک سند نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کبار کی ہے۔ اب اس تاریخ سے بھی کوئی اختلاف نہیں کر سکتا۔ انہوں نے کیا یہ کہ جو تفسیر دی' اس تفسیر کی تائید میں تاریخی واقعہ لکھ دیا' جو تاریخی واقعہ لکھا اس کی تائید میں ایک تفصیلی روایت لکھ دی' تو اب اس کے بعد آپ کے ہاں نبی اکرم ﷺ کے زمانے کی' ان کے عقیدے کے مطابق' قرآن کی تفسیر بھی مرتب ہو گئی اور اس دور کی تاریخ بھی مرتب ہو گئی۔ اب اس تفسیر سے کوئی اختلاف نہیں کر سکتا' اس تاریخ سے بھی کوئی اختلاف نہیں کر سکتا۔ اس ہزار سال میں جس طرح سے اسلام کی یہ گاڑی اصلی پٹڑی سے دوسری پٹڑی پہ جا کے پڑ گئی ہے اُس میں بنیادی طور پر جو ذمے داری عائد ہوتی ہے' جو بنیادی سبب ہے' وہ یہی تفسیر' یہی تاریخ ہے' اسی نہج پر ہر ایک نے تفسیر لکھی تو اس کے بعد' جیسا کہ میں ابھی عرض کروں گا' کہ یہ جو روایات کی بنیادوں کے اوپر تفسیر یا تاریخ کہی جاتی ہے' یہ جو امت کے اندر اتنا زیادہ اختلاف پیدا ہو رہا ہے' اس کی بنیاد ہی یہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ پہ قرآنِ کریم نازل ہوا۔ یہ ظاہر ہے کہ جس انداز سے حضور قرآن کریم کو سمجھ سکتے تھے' اس سے بہتر تو ایک طرف' اس سے الگ کون سا مسلمان قرآن کو سمجھ سکتا تھا' اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ جو تفسیر ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ احادیث کے اندر ہے۔ اب احادیث کی صورت یہ ہے کہ نہ تو نبی اکرم ﷺ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب کر کے دیا اور نہ ہی صحابہ کبار نے کوئی مجموعہ مرتب کیا۔ احادیث کے پہلے مجموعے نبی اکرم ﷺ کی وفات کے ڈھائی تین سو سال بعد جا کر مرتب ہوئے اور یہ کسی پہلے سے Written Material (تحریری مواد) پر مبنی نہیں ہیں' کسی تحریری سند یا مواد پر مبنی نہیں ہیں' بلکہ سب زبانی روایات پر مبنی ہیں۔ امام بخاریؒ نے زبانی روایت کو اپنے مجموعۂ حدیث میں شامل کر لیا۔ جن حدیث کی چھ کتابوں کو سنیوں [1] کے ہاں صحیح ترین قرار دیا جاتا ہے' ان سب میں سرِ فہرست امام بخاریؒ کا مجموعہ ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ''میں نے جب احادیث جمع کرنی شروع کیں' تو چھ لاکھ کے قریب روایات میں نے لوگوں سے سنیں۔ ان میں سے میں نے پانچ لاکھ چورانوے ہزار کو تو خود اپنی صوابدید کے مطابق مسترد کر دیا'

---

[1] ان نکات کی وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء' ص ص 199 تا 218، نیز فٹ نوٹ 1`2(200)۔

تو قریب چھ ہزار احادیث یا روایات رکھیں۔ ان میں سے بھی اگر جو مکرر بیان کی گئی ہیں' کو الگ کر دیا جائے' تو وہ قریباً تین ہزار رہتی ہیں'' لیکن یہ جو تین ہزار رہتی ہیں' ان میں بھی تو کسی روایت کو نہ نبی اکرم ﷺ کی سند ہے' نہ صحابہ کبار کی کوئی تصدیق ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ امام بخاری نے کسی سے سنا' انہوں نے اپنے باپ سے سنا' انہوں نے اپنے استاد سے سنا' انہوں نے فلاں سے سنا' انہوں نے فلاں سے سنا' انہوں نے فلاں صحابی سے سنا' تو انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا تھا۔ ہر حدیث کا یہ انداز ہے۔

آپ سوچیے' عزیزانِ من! کہ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے دو اڑھائی سو سال بعد اس انداز سے' ان اسباب کے ذریعے سے' کہ فلاں نے فلاں سے سنا تھا' جو روایت بیان کی جائے گی' اس میں کہاں تک یقینی طور پر کہا جائے گا' کہ وہ رسول اللہ کی ہے۔ اسی لیے یہ جتنی حدیثیں ہیں' ان میں سے ہر حدیث کے بعد پہلے کہا جاتا ہے کہ ''قال رسول اللہ''۔ حضور نے فرمایا اور آخر میں کہا جاتا ہے ''اوکما قال رسول اللہ'' یا جیسے رسول اللہ نے فرمایا ہے۔ یعنی خود یہ لوگ بھی یقینی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ جو کچھ ہم بیان کر رہے ہیں' یہ رسول اللہ کی کہی ہوئی ہیں اور پھر یہ رسول اللہ کے الفاظ بھی نہیں ہے۔ حدیث کہتے ہیں کہ وہ معنوی طور پر آگے آئیں' یعنی ایک شخص نے یہ سمجھا' اُس نے آگے سمجھایا' اُس نے یہ سمجھا' اُس نے آگے سمجھایا اور دو سو سال کے بعد وہ شخص جس نے بیان کیا' اسے امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں لکھ لیا۔ اس طرح سے یہ احادیث کی چھ مستند کتابیں تو سنیوں کے ہاں ہیں اور اسی قسم کی چار مستند کتابیں شیعہ حضرات کے ہاں ہیں [1] اور کیفیت یہ ہے کہ ایک کتاب دوسری کتاب سے مختلف ہے یعنی خود ایک کتاب کے اندر بہت سے اختلافات ہیں۔ یہ ہیں عزیزانِ من! احادیث کے وہ مجموعے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان میں درج وہ احادیث رسول اللہ کی بیان فرمائی ہوئی ہیں۔

احادیث کے متعلق امام احمد بن حنبل کا فرمان

یہ اس قدر نا قابل اعتماد ہے کہ ان احادیث کے متعلق امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ (164-241H/780-855AD) کا قول ہے کہ احادیث کی کتابوں میں تین قسم کی روایات قابل اعتماد نہیں: پیشین گوئیوں سے متعلق' لڑائیوں سے متعلق' اور تفسیر سے متعلق۔ ان کے اس قول کی تصدیق خود ان تفاسیر سے ہوتی ہے جنہیں نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ مثالیں تو میں' اس میں بے شمار دے سکتا ہوں' لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے میں اس وقت اس کی صرف دو ایک مثالیں نہیں بلکہ ایک ہی مثال دینا کافی سمجھتا ہوں۔ وہ پیش کروں گا۔ آپ اس سے اندازہ لگا لیجیے گا کہ روایات کی رو سے قرآنِ کریم کے سمجھنے میں کتنی مدد مل سکتی ہے۔

سورۂ احزاب میں ہے **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا** (33:69)۔ جماعت مومنین سے کہا جا رہا ہے کہ اے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے موسیٰ کو بہت ستایا' انہیں اذیت دی' تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کو ان کی ان اذیت رسانیوں سے محفوظ رکھا۔ تم ان کی طرح نہ ہو جانا۔ بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ کو کس کس انداز سے ستاتے تھے' اس کی تفصیل قرآنِ کریم کے متعدد مقامات میں موجود ہے۔ حضرت موسیٰؑ اس غلام محکوم قوم کو فرعون [2] جیسے مستبد حاکم کی

---

[1] اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے :: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص۔ 242-200۔

[2] اس کشمکش کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ طٰہٰ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء

غلامی سے نجات دلا کر' وادیٔ سینا میں لے آئے تھے۔ یہی احسان کچھ کم گراں بہا نہیں تھا۔ اس قوم کو چاہیے تھا کہ قدم قدم پر ان کے شکر گزار ہوتے لیکن ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ قدم قدم پر ان کو اذیت دیتے' ان کو تنگ کرتے۔ راستے میں ایک جگہ دیکھا کہ ایک قوم ایک بت کی پرستش کرتی ہے' تو حضرت موسیٰؑ کا دامن پکڑ کر بیٹھ گئے کہ ہمیں بھی ایسا ایک بت بنا دیجیے تاکہ ہم اس کی پرستش کریں۔ کبھی ان کی کیفیت یہ ہے کہ پانی کی تنگی ہوئی ہے' تو جدھر گئے ہیں' انہوں نے کہا کہ موسیٰؑ تم ہمیں کہاں مارنے کے لیے لے آئے ہو۔ وہاں ان کو من وسلویٰ کھانے کو ملتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہمیں تو یہاں بیٹھے ہوئے مصر میں' جو ہم اس قوم کی' اپنی حاکم قوم کی' ہنڈیاں پکایا کرتے تھے' اس کی لذتیں یاد آتی ہیں۔ ہمیں دالیں اور پیاز اور لہسن اور سبزیاں' یہ کچھ دو۔ یہ من وسلویٰ یہ ہم سے روز روز نہیں کھایا جاتا۔

آپ ﷺ چند دن کے لیے ذرا کہیں باہر گئے' سامری [1] نے ایک گئو سالہ بنایا اور انہوں نے اس کی پرستش شروع کر دی۔ وہ اس طرح ایک ایک قدم پر حضرت موسیٰؑ کو ستایا کرتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ان سے کہا کہ یٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ وَ قَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ (61:5)۔ اے قوم! میں نے تمہارے ساتھ کون سی دشمنی کی ہے جس کی وجہ سے تم مجھے قدم قدم پر اس طرح ستاتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف خدا کا رسول ہوں' اس کے پیغامات تم تک پہنچاتا ہوں' تمہیں تو اس کے لیے احسان مند ہونا چاہیے تھا لیکن تمہاری کیفیت یہ ہے کہ ایک ایک قدم پر مجھے تنگ کرتے ہو' اذیتیں پہنچاتے ہو' اسی لیے حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ سے فریاد کی تھی کہ اے اللہ! میں اور میرا بھائی بس ہم یہ دونوں ہیں' جو اپنے ذمے دار ہیں' ورنہ یہ قوم فاسق ہے۔ جو کچھ یہ کر رہی ہے اس کی ذمے داری ہم پہ عائد نہیں ہوتی۔

میں نے یہ تفصیل اس لیے بیان کی کہ یہ معلوم ہو جائے کہ وہ جو قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ اے جماعت مومنین! تم حضرت موسیٰؑ کی قوم کی طرح نہ ہو جانا' انہوں نے انہیں بڑا ستایا تھا اور ان کی اذیت رسانیوں کی تفصیل خود قرآن نے دی ہے' اس کی وضاحت ہو جائے۔

حضرت موسیٰؑ کے متعلق ایک روایت

اب آپ دیکھیے کہ اس آیت کی تفصیل روایات کی رو سے کیا ملتی ہے؟ یہ بخاری شریف کی روایت ہے۔ غور سے سنیے گا' عزیزانِ من! حضرت ابو ہریرہؓ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل برہنہ غسل کرتے تھے۔ ایک دوسرے

---

[1] بچھڑے (گئو سالہ) اور سامری کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورۂ طٰہٰ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء ص ص 242 اور 250 اور فٹ نوٹ 1 (250)۔

کی طرف دیکھا جاتا تھا اور حضرت موسیٰؑ تنہا غسل کیا کرتے تھے۔ بنی اسرائیل نے کہا کہ واللہ! موسیٰؑ کو ہم لوگوں کے ہمراہ غسل کرنے سے سوا اس کے کچھ مانع نہیں کہ وہ..... کے مرض میں مبتلا ہیں۔ اتفاق سے ایک دن موسیٰؑ غسل کرنے گئے اور اپنا لباس پتھر پر رکھ دیا۔ وہ پتھر ان کا لباس لے بھاگا اور حضرت موسیٰؑ بھی اس کے تعاقب میں یہ کہتے ہوئے دوڑے کہ اے پتھر! میرے کپڑے دے دے اے پتھر! میرے کپڑے دے دے' یہاں تک کہ بنی اسرائیل نے موسیٰؑ کی طرف دیکھ لیا اور کہا واللہ! موسیٰؑ کو کچھ بیماری نہیں ہے اور پتھر ٹھہر گیا۔ موسیٰؑ نے اپنا لباس لے لیا اور پتھر کو مارنے لگے۔ ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم! حضرت موسیٰؑ کی مار سے چھ یا سات نشان اب تک اس پتھر پر داخل ہیں۔

عزیز برادران! یہ بخاری شریف کی جلد اول کی روایت ہے جو قرآنِ کریم کی اس آیت کی تفسیر میں بیان کی گئی ہے جس میں قرآنِ کریم نے جماعت مومنین سے کہا تھا کہ تم قوم موسیٰ کی طرح نہ ہو جانا۔ انہوں نے حضرت موسیٰؑ کو بہت ہی اذیتیں دی تھیں۔ اس روایت یا اس حدیث کے اندر اس اذیت رسانی کی تفسیر بیان ہو رہی ہے۔ کس قسم کی ہیں وہ تفاسیر جو احادیث کے اندر ہمیں ملتی ہیں۔ عزیزانِ من! ان کا آپ خود اندازہ لگا لیجیے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم کی تفسیر روایات کی رو سے کی جانی چاہیے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ حالانکہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ یہ روایات یا احادیث رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہیں۔ یہ آپ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں اور زبانی روایتیں کوئی دو سو اڑھائی سو سال کے بعد جمع کی گئی تھیں۔ اب کوئی نہیں کچھ کہہ سکتا کہ ان میں کتنا حصہ حضور ﷺ کا ہے اور کتنا کچھ دوسروں کا ملایا ہوا ہے۔

احادیث کے مجموعوں کے متعلق میرا مسلک یہ ہے کہ ان میں جو باتیں قرآن کے مطابق ہیں' انہیں ہم صحیح تسلیم کر سکتے ہیں لیکن جو قرآن کے خلاف ہیں یا جن سے حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی پر کسی قسم کا طعن پڑتا ہے' ان کے متعلق ہم کہہ دیں گے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں نہیں ہو سکتیں۔ پھر سن لیجیے کہ میں رسول اللہ ﷺ کی کسی حدیث کا انکار نہیں کرتا۔ متذکرہ بالا مواد کی رو سے غلط روایات کے متعلق کہتا یہ ہوں کہ وہ رسول اللہ کی ہو نہیں سکتیں' ورنہ جو احادیث قرآنِ کریم کی تعلیم کے مطابق ہیں' میں نے کبھی بھی اور کہیں بھی ان کا انکار نہیں کیا۔

عزیزانِ من! یہ ہیں سورۃ الفاتحہ کے ان دروس کے اسباب جو آپ کے سامنے پیش کیے گئے اور یہی ہے ان کی پہلی تعارفی نشست۔ اب سورۃ الفاتحہ ہم اگلے درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀.....❀.....❀

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام باری، مانچسٹر

قرآن وسنت یا حدیثِ رسول ﷺ

حدیث کے معنی ہیں بات۔ Saying۔ حدیثِ رسولؐ کا مطلب ہوا آپ ﷺ نے جو بھی فرمایا، جو بات کی۔ سورہ النساء میں ہے کہ فمال ھٰؤلاء القوم لا یکادون یفقھون حدیثا۔ نہ جانے ہماری قوم کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ بات سمجھنا چاہتے ہی نہیں (۴/۷۸)۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری قوم کو کچھ نہیں ہوا، اسے کچھ کر دیا گیا ہے اور اسے فریب دینے والے سب کچھ جانتے بوجھتے اپنے مفاد کی خاطر ایسا کرتے ہیں۔ یہ حضرات قرآن کی تلاوت بھی کرتے ہیں لیکن! وجحدوا بھا واستیقنتھا انفسھم ظلما وعلوا (۲۷/۱۴)۔ یہ قرآن پر یقین کے علی الرغم اسے الگ رکھ کر اپنی سرکشی اور تکبر کی بنا پر دوسری طرف (وضعی روایات کی طرف) نکل جاتے ہیں، جن کے سہارے آج کل ٹیلی ویژن چینلز کے ذریعے ساری دنیا میں قرآن کی صداقت، نبی کریم ﷺ کی سیرتِ مقدسہ اور صحابہؓ کے کردار کے خلاف منتخب وضعی احادیث (مثلاً نابالغ سے شادی وغیرہ) پر بحث ومباحثہ کر کے اسلام کو بدنام اور مسلمانوں کو رسوا کیا جاتا ہے۔ ہمارے مذہبی راہنماؤں کو نہیں معلوم کہ آج کتبِ روایات و احادیث پر انہی کی اجارہ داری نہیں بلکہ یہ ساری دنیا میں مطالعہ کے لئے لائبریریوں میں عام دستیاب ہیں۔

سنت کے معنی ہیں کسی چیز کا جاری رہنا اور یکے بعد دیگرے، مسلسل آتے رہنا۔ یہیں سے اس کے معانی عادت۔ مسلک ومشرب اور قرآن میں سابقہ قوموں کی روش کے آتے ہیں۔ مثلاً اگر اِس قومِ مخاطب نے بھی قوانینِ خداوندی سے انکار کیا تو جو کچھ گذشتہ اقوام کے ساتھ ہوا وہی کچھ اِن کے ساتھ ہوگا سنۃ الاولین (۸/۳۸)۔ اس کے ایک معنی قانون کے بھی ہیں جیسے ولا تجد لسنۃ اللہ تحویلا۔ تم خدا کے قانون میں تبدیلی نہیں پاؤ گے (۷۷/۱۷)۔ اس لفظ کے عام معانی طور طریق Way کے ہیں، جب کہا جائے قرآن و سنت تو اس کا مطلب ہو گا قرآنی قوانین کو نافذ

(Establish) کرنے کے طور طریق۔ ان معانی کی رو سے سنتِ رسول ﷺ کا مفہوم ہوا رسول کریم ﷺ نے جو بھی کام کیا۔ آپ ﷺ نے اجتماعی نظام (دین) قائم کیا اور آپ ہی اس نظام کی سنٹرل اتھارٹی تھے۔ خدا نے ہمیں حکم دیا کہ یاایھا الذین امنوا صلوا علیه و سلموا تسلیما (۳۳/۵۶)۔ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! رسولؐ کے پیچھے پیچھے چلو۔ اس کا اتباع کرو اور تہہ دل سے اس کی اطاعت کرو۔ مذہبی راہنماؤں نے اس کا مفہوم بدل کر کرنے کے کام (سنت) کو فارسی کے لفظ درود کا نام دے کر پڑھنے میں بدل دیا۔ یہ اقامتِ دین کا نام تک نہیں لیتے۔ جونہی یہ آیت کریمہ ہمارے سامنے تلاوت کی جاتی ہے تو ہم اونچی آواز میں چند کلمات دوہرا کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے یہ فریضہ ادا کر دیا۔ قرآن میں ہمارے جیسی قوم کے متعلق ہے کہ فبدل الذین ظلموا قولا غیر الذی قیل لھم فانزلنا علی الذین ظلموا رجزا من السماء بما کانوا یفسقون (۲/۵۹)۔ انہوں نے خدا کے قول کو بدل دیا اس ظلم اور فسق کی وجہ سے ان پر رجز نازل ہو گیا اور وہ ثابت قدم نہ رہ سکے۔ دنیا کی سپر پاور کو تو چھوڑیئے ہم تو اس لڑکھڑاہٹ (رجزاً) کی وجہ سے پڑوسی ملک کے آگے بھی کھڑے نہیں ہو سکتے۔ چودہ صدیاں بیت گئیں علمائے کرام یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ حدیث کیا ہے اور سنت کسے کہا جائے۔ جنرل ضیاء الحق کے دورِ حکومت میں یہ لوگ کہتے تھے کہ منکرِ حدیث اشخاص رجم کو نہیں مانتے۔ اب جنرل پرویز مشرف کی حکومت میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے صاحبزادہ کی طرف سے اخبار میں آیا ہے کہ سنت کے منکر سنگساری کو نہیں مانتے۔ (بحوالہ جنگ کالم نذیر ناجی)۔ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ان پرانی باتوں کو بُھلا کر جب تک ہم خالصتاً قرآن کی طرف نہیں آتے نہ تو دین قائم ہو سکتا ہے نہ ہی مسلم قوم کو نصرتِ خداوندی مل سکتی ہے۔

مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے اڑھائی سو سال بعد دورِ ملوکیت میں مذہب کو ذریعۂ معاش بنانے والے پیشواؤں کے گٹھ جوڑ سے جھوٹی سچی روایات اور احادیث کو قرآن کی مثل منزل من اللہ یعنی وحی غیر متلو قرار دے کر انہیں قرآن پر قاضی ٹھہرا دیا گیا۔ اس طرح قرآن کے اصل نظریات پس پشت ڈال دیئے گئے اور غیر قرآنی نظریات پیشِ نظر رہنے لگے اور عمل انہی کے مطابق ہونے لگا۔ مثلاً وضو کرتے وقت سُنی حضرات پاؤں دھوتے ہیں اور شیعہ حضرات پاؤں کا مسح کرتے ہیں۔ یہ اختلاف' روایت کی رو سے اختلافِ قرأت کے عقیدے کا نتیجہ ہے۔ اس عقیدہ کی رو سے کہا جاتا ہے کہ قرآن کی فلاں آیت میں فلاں لفظ کی بجائے فلاں لفظ نازل ہوا تھا۔ یا لفظ میں حرف زبر

کی بجائے زیر کے ساتھ نازل ہوا تھا۔ فلاں آیت فلاں لفظ کے بغیر نازل ہوئی تھی۔ ثبوت کے لئے دیکھئے کنزالایمان ازمحترم احمد رضا خان بریلوی بڑا سائز حاشیہ آرائشی سورۃ النساء میں قصرالصلوٰۃ کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ یہ آیت (۱۰۱) بغیران خفتم نازل ہوئی تھی۔ اسی سورت کی آیت (۱۱۷) کی تفسیر میں لکھا ہوا ہے کہ اس میں لفظ انثا کی بجائے او ثانا' نازل ہوا تھا اور محترم مولانا مودودی مرحوم کی طرف سے تفہیم القرآن میں وضو کے سلسلہ میں آیت کریمہ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ایک صحابیؓ کی قرأت میں ارجلکم کا لفظ ل کے زیر کے ساتھ نازل ہوا تھا۔ اسی لئے شیعہ حضرات وضو کرتے وقت پاؤں کا مسح کرتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک یہ زیادہ صحیح ہے۔ یہ عقائد اس کتابِ عظیم کے متعلق ہیں جس کی حفاظت کا ذمہ اس کے نازل کرنے والے خدا نے لے رکھا ہے۔ ٹھیک ہے اس نے قرآن کی تفسیر، تشریح اور حاشیہ آرائشی کا ذمہ تو نہیں لیا تھا جن میں روایات سے کام لیا گیا ہے۔ ہم جن جمع کی گئی باتوں کو احادیث کا ذخیرہ کہتے ہیں وہ اصلاً حدیث کا ذخیرہ نہیں ہے۔ وہ الفاظ جو حضورﷺ کے دہن مبارک سے نکلے وہ حدیث رسولؐ تھے۔ لیکن جب ان کا مفہوم راوی نے خود اپنے الفاظ بیان کیا تو وہ حدیثِ رسولؐ نہ رہے بلکہ روایت بن گئے۔ یعنی وہ الفاظ قرآن کی طرح قول رسول کریمﷺ نہ رہے (۸۱/۱۹) بلکہ راوی کے اپنے ہو گئے۔ چونکہ علماء خود اعتراف کرتے ہیں کہ احادیث قدسی بالمعنی روایت ہوئی ہیں اور اسی لئے ہر حدیث کے آخر میں او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شامل کیا جاتا ہے۔ لہٰذا آج جن احادیث کو وحی غیر متلو قرار دیا جاتا ہے وہ احادیث، حضورﷺ کی احادیث ہیں ہی نہیں بلکہ روایات ہیں اور یہ حضورﷺ کی حیاتِ طیبہ میں لکھی نہیں گئی تھیں، یہ سلسلہ حضورﷺ کے بعد شروع ہوا تھا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ مجھ سے کچھ نہ لکھو۔ اگر کسی نے یہ سمجھتے ہوئے کہ اس میں حرج نہیں اور قرآن کے سوا مجھ سے کچھ لکھا ہو تو اسے مٹا دے اور اگر کسی نے جان بوجھ کر جھوٹی بات میری طرف منسوب کی تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہو گا (۱۴۷)۔ ہمارے ہاں اہلِ حدیث حضرات کا فتویٰ ہے کہ کوئی مسلمان اگر کسی ایک روایت و حدیث کا انکار کر دے یعنی یہ کہہ دے کہ یہ بات رسولؐ کی ہو نہیں سکتی تو ان کے نزدیک وہ شخص دائرہ اسلام ہی سے خارج ہو جاتا ہے۔ یاللعجب!! یہ احادیث کس قسم کی ہیں انہیں آپ کتب احادیث کے کسی بھی مجموعہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں چند ایسی روایات قارئین کے پیشِ خدمت ہیں اور ان کے حوالے ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب ''مقام حدیث'' میں میری طرف سے مفت حاصل کر کے دیکھے جا سکتے ہیں۔۔۔۔۔ بخاری کی روایت ہے کہ رسول

اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ موسم کس طرح بدلتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ ''دوزخ نے اپنے پروردگار سے شکایت کی کہ اے میرے پروردگار! میرے ایک حصے نے میرے دوسرے حصے کو کھا لیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسے دو مرتبہ سانس لینے کی اجازت دے دی۔ ایک سانس جاڑوں میں اور ایک گرمی میں۔ پس تم جو سخت سردی اور گرمی دیکھتے ہو یہ جہنم کے اندر باہر سانس لینے سے ہوتا ہے۔'' (موسموں کی اس طرح تبدیلی کے متعلق جب حضور ﷺ کی علمی فضیلت کو اغیار کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ کیا تاثر لیں گے؟)۔ حضرت ابو ہریرہؓ رسول کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ ایک گروہ بنی اسرائیل کا کھو گیا۔ نہیں معلوم کیا ہوا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ چوہے وہی ہیں کہ جب ان کے سامنے اونٹ کا دودھ رکھا جاتا ہے تو وہ نہیں پیتے اور جب ان کے سامنے بکریوں کا دودھ رکھا جاتا ہے تو وہ پی لیتے ہیں۔'' (نہیں معلوم کیا ہوا۔ میں خیال کرتا ہوں کے الفاظ سے ظاہر ہے احادیثِ رسولؐ منزل من اللہ وحی نہیں ہیں)۔

حضرت ابو ہریرہؓ رسول کریمؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا۔ بنی اسرائیل برہنہ غسل کیا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھتا اور حضرت موسیٰ تنہا غسل کیا کرتے تھے۔ تو بنی اسرائیل نے کہا کہ واللہ! موسیٰ کو ہم لوگوں کے ساتھ غسل کرنے سے سوا اس کے کچھ مانع نہیں کہ وہ فتق میں مبتلا ہیں۔ اتفاق سے ایک دن موسیٰ غسل کرنے لگے اور اپنا لباس پتھر پر رکھ دیا۔ وہ پتھر ان کا لباس لے کر بھاگا اور حضرت موسیٰ اس کے پیچھے پیچھے یہ کہتے ہوئے بھاگے کہ ''ثوبی یا حجر! ثوبی یا حجر'' اے پتھر! میرے کپڑے دے دے۔ یہاں تک کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ کو دیکھ لیا اور کہا کہ واللہ! موسیٰ کو کچھ بیماری نہیں اور پتھر ٹھہر گیا۔ موسیٰ نے اپنا لباس لے لیا اور پتھر کو مارنے لگے۔ ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم! حضرت موسیٰ کی مار سے اس پتھر پر چھ یا سات نشان اب تک باقی ہیں۔

صحیح بخاری اور دوسری کتب احادیث میں متعدد راویوں سے روایات ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ طاعون کے مرض کو اللہ تعالیٰ قوموں پر ''سزا'' کے طور پر وارد کیا کرتے تھے اور اسی صحیح بخاری میں یہ روایات بھی بکثرت موجود ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا طاعون کے مرض سے مرنے والا ''ہر مسلمان شہید'' ہوتا ہے۔ یاللعجب۔ پیٹ کے مرض (دست وغیرہ لگنے) سے مرنے والا شہید۔ پھیپھڑوں کے مرض سے مرنے والا شہید۔ ڈوب کر مرنے والا شہید۔ عمارت کے نیچے آ کر مرنے والا شہید ہوتا ہے اور حاملہ عورت وفات پا جائے تو وہ بھی شہید ہوتی ہے۔

صحیح بخاری کی جلد ۶ حدیث نمبر ۲۵۳ میں ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولؐ نے فرمایا! یومِ قیامت

ایک بہت وزنی آدمی آئے گا لیکن خدا کے نزدیک اس کا وزن مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہوگا پھر حضورؐ نے سورہ کہف کی آیت ۱۰۵ پڑھی۔ حدیث کی رو سے یہ تفسیر ہے اس آیت کی: ''یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے قوانین زندگی سے انکار و سرکشی برتتے ہیں۔ یوم قیامت ان کے اعمال کا وزن کرنے کے لئے میزان تک کھڑی نہیں کی جائے گی''۔ علماء حضرات کا فرمان ہے کہ قرآن احادیث کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے اور اللہ کی اطاعت کا ذریعہ کتاب اللہ ہے اور رسولؐ کی اطاعت احادیث کی رو سے کی جاتی ہے۔ ان سے کوئی پوچھے کہ مندرجہ بالا احادیث میں رسول ﷺ کی اطاعت کے لئے کونسے احکام مضمر ہیں جن کی یہ اطاعت کرتے اور کرواتے ہیں؟ اطاعت! حکومت اور حکمرانوں کے احکام وقوانین کی فرمانبرداری کا نام ہے۔ چونکہ زمین پر یعنی انسانی معاشرہ میں نظامِ خداوندی ''اللہ و رسولؐ'' کی حکومت کہیں بھی قائم نہیں ہے اس لئے دنیا کے تمام مسلم و غیر مسلم ممالک میں طاغوت کی اطاعت ہو رہی ہے جس سے خدا نے منع فرمایا تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عطاءالحق قاسمی

جب میری آنکھوں میں خون اتر آتا ہے

میں ایک ٹھنڈے مزاج کا مذہبی آدمی ہوں چنانچہ مجھے فروعی باتوں پر کبھی غصہ نہیں آیا لیکن جب کسی کو دین کے بنیادی اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو میری آنکھوں میں خون اتر آتا ہے اور پھر میں اس کی روک تھام کے لئے اپنی تمام تر توانائیاں استعمال کرتا ہوں' ایسی صورتحال میں آپ اگر کبھی مجھے دیکھیں تو حیران رہ جائیں کہ ایک شخص جو دن میں کتنی ہی بار درگزر سے کام لیتا ہے لیکن جب اس کے سامنے معرکۂ حق و باطل قائم ہوتا ہے تو وہ کس طرح باطل کے لئے شمشیر برہنہ بن جاتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ ایک شخص جعلی ادویات تیار کرتا ہے' اس سے ممکن ہے کئی لوگوں کی صحت پر برا اثر پڑتا ہو بلکہ اس امر کا بھی امکان ہے کہ کچھ لوگ ان ادویات کے استعمال سے مر بھی جاتے ہوں گے لیکن وہ شخص اگر میرا دوست ہے تو اس واقعہ کے علم میں آنے کے بعد بھی وہ میرا دوست ہی رہتا ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ چھوٹی موٹی کمزوریاں ہر انسان میں ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات غفورالرحیم ہے' میں اسے ایک وظیفہ بتاتا ہوں جس کا ورد ہر نماز کے بعد ایک سو ایک مرتبہ کرنا ہوتا ہے اور اپنے اس دوست کو یقین دلاتا ہوں کہ اس وظیفے کی ادائیگی سے اللہ تعالیٰ اس کی اس کمزوری سے درگزر فرمائیں گے۔ میرے دل میں اس کے اس کام کے خلاف کبھی نفرت پیدا نہیں ہوئی کیونکہ میرے نزدیک ہر وہ شخص اچھا مسلمان ہے اور اس کا جنت میں جانا یقینی ہے خواہ اس میں متذکرہ کمزوری جیسی ہزار کمزوریاں ہوں' اگر وہ نماز' روزے اور وظائف کا پابند ہے۔ اسی طرح میرے جاننے والوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو رشوت لیتے ہیں یا سرکار کے حکم پر جانتے بوجھتے ہوئے بے گناہوں کو پکڑ لیتے ہیں' انہیں غائب کر دیتے ہیں یا انہیں جیل بھجواتے ہیں۔ ان کے علاوہ میں ایسے لوگوں سے بھی محبت اور نرمی سے ملتا ہوں جو ذخیرہ اندوز ہیں' گراں فروش ہیں' سمگلر ہیں' اشیائے خورونوش میں ملاوٹ کرتے ہیں' بردہ فروشی میں ملوث ہیں' اپنے حلف کی خلاف ورزی کرتے ہیں' آئین کو پاؤں تلے روندتے ہیں یا ان میں اسی طرح کی اور چھوٹی موٹی کمزوریاں ہیں' ان میں سے کسی کو دیکھ کر بھی میری آنکھوں میں خون نہیں اترتا کہ ان

سے اگر کسی کو نقصان پہنچتا ہے تو ملک کو پہنچتا ہے یا عوام کو جو دین سے دور ہو چکے ہیں ویسے بھی میں جانتا ہوں کہ وہ اپنی ان کمزوریوں کو اپنے نماز' روزہ کی پابندی سے برابر کرتے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی ذات غفور الرحیم ہے' وہ ایک کلمہ گو مسلمان کو جو شعائر اسلامی کی پابندی کرتا ہو' کیسے جہنم میں بھیجے گا' میرے نزدیک یہ گناہ کوئی ایسے نہیں ہیں کہ جن سے سارے دوسرے نیک اعمال برباد ہو جاتے ہیں۔

مگر اپنے اتنے ٹھنڈے مزاج اور وسیع القلبی کے باوجود کچھ گناہ ایسے ہیں جو دین کے بنیادی اصولوں سے متصادم ہیں اور یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتے' چنانچہ میں جب کسی خاتون کو برقعے کے بغیر دیکھتا ہوں تو میری آنکھوں میں خون اتر آتا ہے مگر اللہ تعالیٰ مجھے معاف کرے' میں ایمان کے اس درجے پر فائز نہیں ہوں جس میں اس نوع کے گناہ کبیرہ کی روک تھام بزور شمشیر کی جاتی ہے لیکن الحمدللہ ان غازیوں کے لئے میرے دل سے دعائیں نکلتی ہیں جو ایسی عورتوں کے سرتن سے جدا کرتے ہیں' میں نے انہیں غازی اس لئے قرار دیا کہ خدا کے فضل سے آج تک انہیں کبھی کسی عدالت سے سزا نہیں ہوئی اور یوں وہ شہادت کے درجے پر فائز نہیں ہو سکے۔

اسی طرح جب میں کسی بے دین کو بغیر استنجیٰ کئے پتلون کے بٹن بند کرتے یا ازار بند باندھتے دیکھتا ہوں تو میں اس خیال سے کانپ جاتا ہوں کہ اس کے کپڑوں اور بدن پر گرنے والے ناپاک پانی کے قطرے اسے جہنم کے بدترین حصے میں دھکیل دیں گے مگر اسے اس کا احساس تک نہیں ہے چنانچہ ایک مسجد کی عمارت کے بیرونی حصے پر لکھا تھا **''صفائی نصف ایمان ہے''** میں نے یہ کاٹ کر اس کی جگہ لکھوایا **''طہارت نصف ایمان ہے''** صفائی کا معاملہ اس دنیا سے ہے جبکہ طہارت کا معاملہ آخرت سے ہے' ایسے بے دین لوگوں پر طہارت کی اہمیت واضح کرنے کے لئے کئی درد دل رکھنے والے اہل ایمان پُرہجوم سڑکوں پر اپنے متحرک ہاتھ کے ساتھ چہل قدمی بھی کرتے ہیں لیکن جن دلوں پر قفل لگ چکا ہو' ان پر اس کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔

میری آنکھوں میں اس وقت بھی خون اتر آتا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ لوگ ''غسل'' کے آداب سے واقف نہیں ہیں۔ وضو کرتے ہیں تو اس کے تمام تقاضے پورے نہیں کرتے' انہیں یہ بھی نہیں پتہ کہ چاول کے دانے کے برابر بالوں والا معاملہ کیا ہے' یہی حال خواتین کا ہے' وہ اپنے مخصوص ایام کی دینی نزاکتوں سے بے خبر ہیں' غرضیکہ کوئی ایک معاملہ ہو تو اس کا ماتم کیا جائے' پورا معاشرہ بے دینی کی لپیٹ میں آیا ہوا ہے۔

ایک فاسق و فاجر کالم نگار نے جو بدقسمتی سے ایک عالم دین کا بیٹا ہے' ایک دفعہ ''دو نمبر قبرستان'' کے عنوان سے ایک کالم لکھا جس میں اس نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ جو لوگ دو نمبر کام کرتے ہیں' ان کا قبرستان عام

مسلمانوں سے الگ ہونا چاہئے اور دونمبر کاموں سے اس کی مراد رشوت، اسمگلنگ، ملاوٹ، قتل، کرپشن اور بردہ فروشی وغیرہ تھی اور دلیل اس نے یہ دی کہ جو ان جرائم کا ارتکاب کرتا ہے، اس کا خمیازہ پورے معاشرے اور ملک کو ادا کرنا پڑتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ حقوق العباد کے گناہگار کو تبھی معاف کرے گا اگر کروڑوں لوگوں کے ان قاتلوں کو ''مقتولین'' معاف کرنا چاہیں گے۔ اسی طرح حضورﷺ بھی ان بدکرداروں کی شفاعت کبھی نہیں فرمائیں گے جنہوں نے ان کے امتیوں کی زندگیاں اجیرن بنا دیں۔ جبکہ جو شخص حقوق اللہ ادا کرتا ہے، اس کا فائدہ صرف اس کی ذات کو پہنچتا ہے اور وہ بھی صرف اس صورت میں اگر اس کے دوسرے اعمال بھی ٹھیک ہوں۔ اس نا ہنجار کالم نگار نے یہ بھی لکھا کہ جو شخص حقوق اللہ کی ادائیگی میں کوتاہی کرجاتا ہے، اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے، وہ چاہیں تو اسے معاف کر دیں چنانچہ دونمبر کام کرنے والے جن بدکردار لوگوں کی بخشش کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے نہیں لیا، ان کا قبرستان ان گناہگار مسلمانوں سے الگ ہونا چاہئے جنہیں حضورﷺ کی شفاعت حاصل ہوسکتی ہے اور اللہ تعالیٰ بھی ان کی ان کوتاہیوں سے صرف نظر کرسکتا ہے جن سے کسی دوسرے کی ذات کو نقصان نہیں پہنچا۔

یہ کالم پڑھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا، میں نے اس کالم نگار کو خط لکھا کہ دینی مسائل پر لکھنے سے پہلے علمائے کرام سے مشورہ کرلیا کرو، صرف وہی جانتے ہیں کہ اسلام کیا ہے اور اسلام کیا نہیں ہے؟ خطبات جمعہ اور دینی اجتماعات میں ہونے والی تقریریں سن لو جن میں معاشرتی برائیوں کا ذکر برائے نام ہوتا ہے، جبکہ سارا زورِ خطابت انہی موضوعات پر صرف ہوتا ہے جن کے حوالے سے میرا بی پی ہائی ہو جاتا ہے۔ میں نے یہ بھی لکھا کہ ہمارے علمائے کرام سائن بورڈوں پر عورتوں کی تصویریں دیکھ کر غیظ وغضب میں آجاتے ہیں اور پھر ان کے عقیدت مند ان عورتوں کے چہروں پر سیاہی پھیرنے کے لئے برش ہاتھوں میں لئے سڑکوں پر نکل آتے ہیں، ویلنٹائن ڈے، بسنت اور نیو ایئر پر بھی ان کی غیرت ایمانی جاگتی ہے اور وہ لاٹھیاں لے کر گھروں سے نکل پڑتے ہیں اور ان مقامات پر پل پڑتے ہیں جہاں یہ فحاشی ہو رہی ہوتی ہے لیکن کیا کبھی انہوں نے کسی ملاوٹ کرنے والے، کسی ذخیرہ اندوز، کسی بلیکئے، کسی بردہ فروش یا کسی اسمگلر کے کاروباری اڈے پر حملہ کیا ہے؟ اگر نہیں کیا تو اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اسلام کی اسی تعبیر کو صحیح مانتے ہیں جس کے تحت حقوق العباد کی ادائیگی کی حیثیت محض ثانوی ہے، جبکہ حقوق اللہ ہی اصل چیز ہیں۔ مگر اس بے دین نے میرا یہ خط شائع نہیں کیا، اور یوں ایک بار پھر میری آنکھوں میں خون اتر آیا کہ وہ شخص فہم دین کا دعویٰ کررہا ہے جسے پتہ ہی نہیں دین کیا ہے، اس پر میں نے دعا کی کہ یا خدا مجھے توفیق دے کہ میں ایمان کے پہلے درجے پر فائز ہوسکوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یکے از مطبوعات باغبان ایسوسی ایشن

ہمارا ماٹو "قرآن فہمی اور باغبانی"

قرآن کریم میں ہے:

قل انما اعظکم بواحدۃ ان تقوموا للہ مثنی و فرادیٰ ثم تتفکروا (۳۴/۴۶)

"میں تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ تم خدا کے لئے ایک ایک، دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ اور پھر سوچو!" (مفہوم القرآن)

☆ مشرق و مغرب میں مسلمانوں کا یکساں محترم! مفکر ابن خلدون فرماتا ہے:

"جب سے مسلمانوں نے اپنی عقل سے کام لینا اور اپنے ذہن سے سوچنا ترک کر دیا ہے وہ ایک ایسے زوال کا شکار ہیں جس کا انجام لرزہ خیز ہے۔"

☆ ہمارے پیارے نبی جناب محمد ﷺ کا ارشاد ہے:

"اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ کل قیامت آ ئے گی تو آج بھی میں کھجور کا ایک نیا پودا لگاؤں گا۔" (بحوالہ دانائی کی تلاش)

☆ باغبان حضرات ہر مہینے کی ۱۵۔۳۰ تاریخ کو اپنے غیر رسمی اجتماعات میں اپنے تجربات اور معلومات سے دوسروں کو آگاہ کرتے ہیں۔

☆ کوئی اجنبی پودا آپ کے باغیچہ میں پیدا ہو تو اسے کبھی ضائع نہ کریں بلکہ تحقیق کر لیں۔

☆ "عبادت کی قضا ہے خدمت کی نہیں"، سب سے اچھی خدمت دوسروں کو پودوں کا تحفہ دینا ہے۔

☆ باغات کے قصبہ یا گاؤں کی رابطہ سڑک کا ہونا ضروری ہے تا کہ شہر یا ریلوے اسٹیشن تک پھلوں کی پیداوار آسانی سے پہنچائی جا سکے۔

☆ باغ لگانے سے پہلے تجزیۂ زمین اور اس کی مناسبت سے موزوں پھلدار پودوں کا انتخاب ضروری ہوتا ہے۔

☆ آب و ہوا۔ درجہ حرارت۔ بارش۔ آندھی۔ اولے۔ کورا۔ سردی۔ سیلاب اور دیگر موسمی حالات کے مطابق باغ کی ابتداء کرنا چاہئے۔

☆ جہاں زیر زمین پانی کی سطح ۵ فٹ کے قریب ہو وہاں پودے ناکام ہو جاتے ہیں۔

☆ ذرائع آبپاشی کا یقینی ہونا باغ کی کامیابی کے لئے اشد ضروری ہے۔

پتہ رابطہ: (۱) ملک حنیف وجدانی، صدر باغبان ایسوسی ایشن، سنبل سیداں، نیو مری۔ (۲) صبینہ یاسمین، سینئر نائب صدر، باغبان ایسوسی ایشن، ٹبی سیداں، سوہاوہ، جہلم۔ (۳) محمد افضل ولد عبدالحمید، چک نمبر 215 (تاحیات ممبر)، باغبان ایسوسی ایشن، بورے والا، وہاڑی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(انتخاب) محمد سلیم اختر

قرآن۔۔۔غیروں کی نظر میں

قرآن ہمیشہ مسلمانوں کا ملجا و ماویٰ رہا ہے

پروفیسر ایڈورڈ مونتے اپنی تالیف ''عیسائی مذہب کی اشاعت اور اس کے مخالف مسلمان'' (صفحہ ۱۷، ۱۸ پیرس ۱۸۹۰ء) میں لکھتے ہیں:

''اگر لفظی و تاریخی اعتبار سے شائستگی و معقولیت Rationalism کے معانی کو بہت زیادہ وقعت دی جائے۔ تو اسلام یقیناً ایک معقول مذہب ہے۔ اس قاعدے کے مطابق جو دلائل کی رو سے قائم کردہ اصولوں پر مذہبی اعتقادات کی بنیاد رکھتا ہے اسلام پر ''معقولیت'' کی تعریف ہو بہو صادق آتی ہے۔ یہ سچ ہے، کہ محمد ﷺ پیکرِ ذوق و ہیکل جذبہ تھے اور حضور کا آئینۂ قلب جوشِ ایمان کی ضیا اور یقین کامل کے لمعات سے روشن تھا۔ آنحضرتؐ نے اس بیش بہا وصف کی جلوہ باریوں سے اپنے کثیر التعداد پیروؤں کے سینوں کو منور کر دیا۔ حضورؐ نے اپنے اس آئین اصلاح کو الہام کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ لیکن اس قسم کا الہام ایک قسم کا کشف ہے۔ حضورؐ کا مذہب تمام کا تمام ایسے اصولوں کا مجموعہ ہے جو معقولیت کے امور مسلمہ پر مبنی ہیں۔ مسلمانوں کے نزدیک عقیدۂ اسلام کو مجملاً یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ خدا ایک ہے اور اس کا رسول (برحق ہے) اور ہم جو ٹھنڈے دل سے حضور کی تعلیم و اصول پر نہایت دقت نظر سے غور کرتے ہیں اس مذہب کے عقیدے کو مختصراً ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں ''توحید و رسالت کا یقین'' اور خدا و عاقبت کا ایمان'' یہ دو اصول جو مذہبی عقیدے کی اساس اور مذہبی افراد کے نزدیک استدلال و معقولیت کے سنگِ بنیاد پر قائم ہیں قرآن (کریم) کی مقدس تعلیم کا لبِ لباب ہیں۔ اس تعلیم کی سادگی اور صفائی فی الواقع وہ زبردست قوتیں ہیں جو مذہب اسلام اور اس کی تبلیغ و ترقی میں برابر عمل کر رہی ہیں۔ لیکن پیغمبرِ عالم (صلعم) کی مقدس تعلیم و تلقین کی ہر معنی میں عالمگیر ترقی کے باوجود قرآن کریم مسلمانوں کا ہمیشہ ملجا و ماویٰ رہا

ہے اور یہ وہ کتاب ہے جس میں مسئلہ توحید ایسی نفاست اور پاکیزگی اور ایسے جلال و جبروت اور کمال تیقن کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اسلام کے سوا کسی اور مذہب میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ ایک ایسے مذہب کے متعلق جو ایسا مکمل' روحانیات کی تمام پیچیدگیوں سے اس قدر مبرا اور ایسا آسان ہو کہ ہر شخص اس کے مسائل فوراً سمجھ سکتا ہو توقع کی جا سکتی ہے کہ اس میں لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے کی معجزانہ طاقت ہو گی اور حقیقتاً اسلام میں ایسی طاقت موجود ہے۔''

قرآن پر عمل کرنے سے سارے جہان کی حکمرانی مل سکتی ہے

موسیو لیون روش ماضی قریب کی فرانسیسی حکومت کے ایک نہایت معتمد کارندے اور جاسوس کی سطور ذیل خاص طور پر قابل غور ہیں۔ موسیو موصوف کو حکومت فرانس نے امیر عبدالقادر الجزائری پر جاسوس مقرر کیا' اور یہ بھی اشارہ کر دیا تھا کہ اس کے پاس بظاہر مسلمان بن کر رہے اور کوئی ایسی سبیل نکالے کہ اس پر اس کا پورا پورا اعتماد جم جائے۔ اس نے ایسا کیا اور کامیاب ہوا اور مسلمانوں کے ملک میں تیس برس اقامت رکھی۔ اس اثنا میں عربی زبان اور اس کے فنون' اسلام اور اس کے علوم کی تعلیم حاصل کی' اور الجزائر' تیونس' مصر' حجاز اور قسطنطنیہ جیسے عظیم الشان اسلامی ملکوں کے حالات اچھی طرح معلوم کئے۔ پھر ایک کتاب لکھی۔ جس کا نام ''اسلام میں تیس سال'' ہے۔ اس میں وہ لکھتا ہے:

''میں طویل زمانے تک اسلام کو اس واسطے گلے لگائے رہا کہ امیر عبدالقادر کو حکومت فرانس کی کسی چال میں پھنسا لوں۔ میں اس حیلے میں کامیاب ہوا۔ اور امیر نے پورے وثوق کے ساتھ مجھ کو اپنا سیکریٹری بنا لیا۔۔۔ میں نے اس دین کو۔۔۔ جس کو ہم میں بہت سے لوگ معیوب کہتے ہیں۔۔۔ جہاں تک میرا عرفان ہے' ہر دین سے افضل دیکھا۔ یہ ایک انسانی' طبیعی' اقتصادی اور ادبی دین ہے۔ ہمارے قوانینِ وضعیہ میں کوئی ایسا قانون مجھ کو یاد نہیں ہے جو قرآن میں مشروع و موجود نہ ہو۔ میں نے اس قانون کی طرف بھی رجوع کیا۔ جس کو جول سیمون ''شریعت طبیعیہ'' کہتا ہے۔ تو اس کو بھی ایسا ہی پایا۔ کہ گویا سربسر قرآن کی شریعت اسلامی سے ماخوذ ہے۔ پھر میں نے یہ دریافت کیا' کہ مسلمانوں کے نفوس میں اس دین کی تاثیر کیا ہے' تو دیکھا' کہ اس نے ان کو شجاعت و شہامت' حلم و خاکساری' اور جمال و کرم سے بھرپور کر رکھا ہے' بلکہ میں نے ان کو بھلائی' مہربانی اور احسان میں ان نفوس کے نمونہ پر پایا جن کا تصور فلسفی لوگ کسی ایسے عالم میں کیا کرتے ہیں جو شرارت' بیہودگی اور

ناراستی سے ناآشنا سمجھا جاتا ہے۔

پس مسلمان ایک ایسا سادہ آدمی ہے' جو کسی سے بدگمانی نہیں کرتا۔ پھر وہ روزی کی طلب میں کسی حرام چیز کو حلال نہیں سمجھا کرتا۔ اسی لئے وہ اسرائیلیوں اور بعض مسیحیوں سے مال و دولت میں کمتر رہتا ہے۔

میں نے اسلام میں دو ایسے اجتماعی مسئلوں کا حل دریافت کیا ہے۔ جنہوں نے سارے جہان کو مشغول کر رکھا ہے۔

(۱) پہلا قرآن کے اس قول میں ہے۔ انما المومنون اخوۃ۔ ایماندار بھائی بھائی ہی ہوتے ہیں۔ یہ اشتراکیت کا بہترین قاعدہ ہے۔ اور

(۲) دوسرا زکوٰۃ کے ہر مالدار پر فرض ہونے اور مفلسوں کو (اگر مالدار برغبت ادا نہ کریں) تو زبردستی اس کے وصول کر لینے کا حق بخش دینے میں (یعنی مسلمان حاکم کی وساطت سے) یہ فوضویت یعنی بر چھاگروی کا درمان ہے۔

اسلام محامد و فضائل کا دین ہے۔ اگر اس کو کہیں ایسے اشخاص مل جاتے' جو لوگوں کو جیسی کہ چاہئے اس کی تعلیم دیتے اور اس کی پوری پوری تفسیر کرتے تو مسلمان آج سارے جہان سے آگے اور ہر میدان میں اسبق ہوتے۔ لیکن ان کے درمیان ایسے شیوخ پیدا ہو گئے ہیں جو اس کے کلمات کو تحریف' اس کے جمال کو مسخ اور اس میں نئی نئی باتیں شامل کر رہے ہیں۔ میں قیروان' اسکندریہ اور مکہ میں' ایسے ایسے کئی مولویوں اور مرشدوں کو بہکانے میں کامیاب ہو چکا ہوں' ان لوگوں نے الجزائر کے مسلمانوں کو اس مضمون کے فتوے لکھ لکھ کر بھیجے کہ ان پر فرانسیسیوں کی اطاعت واجب اور ان کے برخلاف شورش کرنا حرام ہے اور یہ بھی لکھا کہ فرانسیسی حکومت خلق کے لئے خدائے پاک کی بہترین نعمت ہے۔ اور اس مطلب کو نکالنے کے لئے مجھ کو اس سے زیادہ کوئی کلفت نہیں ہوئی کہ چند سونے کے برتن نذر کرنے پڑے۔''

قرآن ضرور الہامی کتاب ہے

ریورنڈ آرمیکسویل کنگ اپنی تقریر ''دین اسلام'' میں جو ۱۷ جنوری ۱۹۱۵ء کو قدیم پریسبی ٹیرین چرچ نیوٹو نارڈز میں کی گئی' فرماتے ہیں:

''اسلام کی آسمانی کتاب قرآن ہے' جو (حضرت) محمد ﷺ کے زمانہ نبوت کے الہامات کا مجموعہ ہے۔ اس میں نہ صرف مذہب اسلام کے اصول وقوانین مندرج ہیں بلکہ اخلاق کی تعلیم' روزمرہ کے کاروبار کے متعلق ہدایات اور قانون بھی ہیں۔ اس لحاظ سے

مسلمانوں کو عیسائیوں پر فوقیت ہے کہ اسلام کی مذہبی تعلیم اور قانون علیحدہ چیزیں نہیں ہیں۔

قرآن نے یہودیوں' عیسائیوں اور زرتشتیوں کے مذاہب پر پوری پوری روشنی ڈالی ہے۔

جس طرح خدا نے یہودیوں کی تورات سے' عیسائیوں کی انجیل سے راہنمائی کی۔ اسی طرح مسلمانوں کو قرآن سے صراطِ مستقیم دکھائی۔

مذہب اسلام کی بنا جمہوریت پر ہے۔ وہ تمام بنی نوعِ بشر کو برابر سمجھتا ہے اور انسانی روح کو اس ذاتِ پاک سے اور بھی پیوستہ کرتا ہے جس سے وہ آ گے ہی گہرا تعلق رکھتی ہے' نیز جو اس کا منبع ہے۔

اسلام کی جمہوری تعلیم میں ایک حصہ عورتوں کے متعلق بھی ہے۔ قرآن میں جہاں کہیں عورتوں کا ذکر آیا ہے۔ تعظیمی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ ماں کے ساتھ محبت رکھنے' اور اس کی تعظیم کرنے اور بیوی کے ساتھ محبت وشفقت کرنے پر پورا زور دیا گیا ہے۔

پیروانِ اسلام کا حسنِ اخلاق قابل تعریف ہے۔ ان کا طرزِ عمل خدا کے احکام کے تابع ہے۔ تسلیم ورضا یعنی اپنے تمام امور خدا کے سپرد کر دینا مسلمانوں کی مذہبی زندگی کی ایک لازمی شرط ہے۔

جو مذہب رضائے الٰہی پر راضی رہنے کی ایسی عمدہ تعلیم دے اس کے پیرو یقیناً صداقت دوست اور انصاف پسند' داد وستد کے کھرے اور عہد کے پکے ہوں گے۔ یہ قرآن سے ثابت ہوسکتا ہے اگر ہم اس کے برخلاف ثابت کرنا چاہیں تو ہماری اپنی عقل ہی انکار کردے گی۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ قرآن محمدﷺ کی تصنیف ہے اور اس میں جو کچھ ہے' وہ سب توریت اور انجیل وغیرہ سے لیا گیا ہے۔ مگر میرا ایمان ہے کہ اگر الہامی دنیا میں الہام کوئی شے ہے اور الہام کا وجود مکمل ہے تو قرآن شریف ضرور الہامی کتاب ہے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام سچے نبی نہ تھے اور قرآن ان کی ذاتی تصنیف ہے۔ اگر یہ ہو' تو محمدﷺ کو ایسی کتاب کی کیا ضرورت پڑی تھی کہ اپنے کو خود ہی تنبیہہ کرتے اور پھر اس سرزنش کو قرآن میں رہنے بھی دیتے۔''

قرآن کا نزول ضرور وحی الٰہی سے ہوا ہے

ڈاکٹر غرینیہ Dr. Paul Grenier سابق ممبر مجلس شوریٰ فرانس نے استاد محمود بک سالم سے اپنے قبول اسلام کا سبب بیان کرتے ہوئے کہا:

''میں ایام شباب میں بحری طبیب تھا اور ہمیشہ جہازوں میں ماء وسماء کے مابین دن گزارتا تھا۔

ایک دفعہ مجھ کو قرآن کا ایک نسخہ موسیو سا قاری کے قلم سے فرانسیسی میں ترجمہ کیا ہوا دستیاب ہوا۔اس میں میں نے سورۂ نور کی ایک آیت کا ترجمہ پڑھا۔ جس میں یہ ذکر تھا کہ وہ اپنے انکار کی حالت میں اسی طرح دیوانہ وار ہاتھ پاؤں مارتا ہے جیسے کہ ڈوبنے والا جاڑوں کے دن جب کہ گھٹا ٹوپ بادل چھار ہا ہولہروں کی تاریکیوں میں بیہودہ تگ و دو کرتا ہےاور وہ آیت یہ تھی۔او کظلمات فی بحر لجی یغساہ موج من فوتہ سحاب ظلمات بعضھا فوق بعض۔ اذا اخرج یدہ لم یکدیراھا' ومن لم یجعل اللہ لہ نورا فمالہ من نور ٥(ترجمہ)یا جیسے کہ تاریکیاں کسی گہرے سمندر میں' جس کو ڈھانپے ہوئے ہو۔ایک لہراس کےاوپر سےایک اورلہراوراس کےاوپر سے بادل' تاریکیاں بھی کیسی کہ ایک کے اوپر دوسری' جب وہ اپنا ہاتھ نکالے' تو اس کو وہ دکھائی دیتا نظر نہ آئے اور وہ شخص جس کے لئے اللہ کوئی روشنی نہ کرےاس کے لئے کچھ روشنی نہ ہوگی۔

جس زمانے میں یہ آیت میں نے پڑھی تھی۔ ابھی ہدایت اسلام سے مشرف نہ ہوا تھا اور نہ مجھے مرشدِ اعظمﷺ ہی کا کچھ حال معلوم تھا۔ ہاں اس سے میرے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ محمدﷺ ضرور کوئی ایسا شخص ہے جس نے اپنی ساری زندگی سمندروں میں گزاری ہے لیکن باوجود اس کے بھی مجھے حیرت تھی کہ کسی شخص سے یہ کیسے ممکن ہے کہ گمراہوں کی آوارگی کا ایسا مختصر حال بیان کردے جس کےتھوڑے سے لفظوں میں سمندروں کے تمام خطرات اور طبعی حالات اس جامعیت کے ساتھ آجائیں۔گویا ان کو انسان اپنے حواس سے مشاہدہ کررہا ہےاور پھراس اسلوب سے کہ سمندروں کے خطرات کا کوئی بلیغ ترین ماہر بھی اس طرح بیان نہ کرسکے۔

پھر جب اس کے بعد مجھ کو یہ معلوم ہوا' کہ محمدﷺ نے کبھی سمندر پر سواری نہیں کی اور علاوہ بریں وہ امی بھی تھے۔تو میں نے قرآن کو پھر ہاتھ میں لیا' اور سورۂ نور اور اس کتاب کی باقی آیتوں میں خوب غور کیا۔تو مجھے یقین ہوگیا کہ یہ کسی بشر کا کلام تو ہونہیں سکتا۔ضرور اللہ تعالیٰ کی وحی ہی سے اس کا نزول ہوا ہے۔پس میں مسلمان ہوگیا۔اور ہمیشہ اس اسلام پر فخر کرتا رہوں گا۔ جو میری نگاہ میں ایک معقول فطری دین ہے اور جو چیزیں دوسرے مذاہب میں بت پرستی کی باقی ہیں۔ان سب سے پاک۔''

افلا یتدبرون القران

قرآن ایک عظیم الشان ملکی اور تمدنی نظام پیش کرتا ہے

موسیو اوجین کلافل نامور فرانسیسی مستشرق جنہوں نے یہودیوں' عیسائیوں اور مسلمانوں کے مذہبی مسائل و عقائد کی تحقیق و تدقیق میں اپنی تمام عمر صرف کر دی۔ اپنے ایک مضمون کے تحت میں جو ۱۹۰۱ء میں فرانسیسی اخبارات میں شائع ہوا۔ رقمطراز ہیں:

''قرآن مذہبی مسائل و عقائد ہی کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس میں اجتماعی (سوشل) احکام بھی ہیں۔ جو نوع انسان کے لئے زندگی کی ہر حالت میں مفید ہیں۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک ایسا مجموعہ ہے۔ جس سے تمدن کے قوانین' جرائم اور ان کی سزاؤں کے قوانین اور وہ قوانین جن میں دنیا کی مختلف اقوام کے درمیان تعلق کا سلسلہ قائم ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حفظان صحت کے قوانین بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ محمدﷺ اس نظام کو جس کا دائرہ وسیع ہے۔ دنیا کی تمام قوموں کے درمیان پھیلانا چاہتے تھے بلکہ ان کو مجبور کرنا چاہتے تھے کہ وہ اس نظام کو قبول کریں۔ پس ان کا مقصد اعظم یہ تھا کہ مسلمانوں کو مادی ترقی کا بلند ترین درجہ حاصل ہو۔ اس لحاظ سے مسلمانوں کے قومی اتفاق کا مسئلہ جو آج کل یورپ میں زیر بحث ہے۔ کوئی نئی بات نہیں ہے کیونکہ مذہب اسلام کی بنیاد ہی اس اصول پر رکھی گئی ہے اور اس کی غرض ہی یہ ہے کہ دنیا کی مختلف قومیں اسلام کے علم کے نیچے جمع ہوں۔ مسلمانوں کے اتفاق کا مسئلہ سلافی اور جرمن اقوام کے خیالات سے بالکل مختلف ہے اور دونوں کی ایک غرض نہیں ہے۔

جب ہم اس زمانہ پر خیال کرتے ہیں۔ جس میں پیغمبر اسلامﷺ نے اپنی نبوت اور رسالت کا علم بلند کیا اور جس میں ایک ایسا کامل مجموعہ قوانین تیار کیا گیا جو دنیا کی ملکی' مذہبی اور تمدنی ہدایتوں کے لئے کافی ہے۔ تو ہم نہایت حیران ہوتے ہیں کہ ایک ایسا عظیم الشان ملکی اور تمدنی نظام جس کی بنیاد کامل اور سچی آزادی پر ہے۔ کس طرح قائم کیا گیا۔ پس ہم دل سے اقرار کرتے ہیں کہ اسلام ایک ایسا مجموعۂ قوانین ہے جو ایک بلند ترین انسانی دماغ کا نتیجہ ہے۔''

قرآن سے بہتر کوئی دستور العمل انسان کے لئے موجود نہیں

مسٹر جان ڈیون پورٹ جو ایک مشہور ادیب اور مایۂ ناز سیرت نگار تھے۔ اپنی تصنیف دی گریٹ ٹیچر (The Great Teacher) میں لکھتا ہے:

''قرآن ایک آسان اور عام فہم مذہبی قانون ہے۔ جس میں انسانی زندگی کی اصلاح کے لئے سب کچھ موجود ہے۔ اس کی ایک امتیازی شان یہ ہے کہ اس کی تعلیمات انسانی فطرت کے مطابق ہیں اور یہ دلکش انداز میں اصلاح کی دعوت دیتا ہے' اس کی عام فہم تعلیمات سے عرب کے جاہل وحشی سمجھدار اور پرہیزگار بن گئے۔ اس کے مذہبی قانون نے ایک طرف روح کی اصلاح کے لئے ہدایت کی ہے۔ اور دوسری جانب دنیوی ترقی کے بھی بیش بہا اصول تعلیم کئے ہیں۔

وہ کہتا ہے کہ اپنی روزی کے لئے محنت کرو۔ انسان کے لئے کچھ نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ محنت کرے۔ کیا یہ ایک زریں ہدایت نہیں ہے؟ اور کیا اس کو پڑھنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی تعلیمات فطرت انسانی کے مطابق نہیں ہیں؟ تاریخ شاہد ہے کہ جن اشخاص نے قرآن پر عمل کیا وہ روحانی اعتبار سے کامیاب تھے اور دنیاوی حیثیت سے بھی۔ جو اس کی ہدایتوں کو پیشِ نظر رکھتے تھے' وہ حیرت انگیز تدبر کے مالک تھے۔ ان کے دماغی اوصاف غیر معمولی اور ان کا تخیل اعلیٰ درجہ کا تھا۔ وہ اپنے نفس پر پورا قابو رکھتے تھے اور امیر و غریب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے تھے۔ ہم انصاف کی روشنی میں یہ کہہ سکتے ہیں' کہ قرآن سے بہتر کوئی دستور العمل انسان کو عملاً نیکی کی طرف راغب کرنے اور برائیوں سے بچانے کے لئے رہنما نہیں ہوسکتا۔''

(دی گریٹ ٹیچر' صفحہ ۹۶۰)

قرآن ایک مشترکہ قانون اور ایک زبردست تحریکِ عمل ہے

یہی مصنف اپنی کتاب موسومہ ''محمد اور قرآن'' کے صحیفۂ آسمانی ہونے کے متعلق لکھتا ہے:

''قرآن عالمِ اسلامی کا ایک مشترکہ قانون ہے۔ یہ معاشرتی' ملکی' تجارتی' فوجی' عدالتی اور تعزیری معاملات پر حاوی ہے۔ لیکن بایں ہمہ ایک مذہبی ضابطہ ہے۔ اس نے ہر ایک چیز کو باقاعدہ بنایا ہے۔ مذہبی رسوم سے لے کر حیاتِ روزمرہ کے افعال' روحانی نجات سے جسمانی صحت' اجتماعی حقوق سے انفرادی حقوق' شرافت سے دنایت اور دنیوی سزا سے لے کر اخروی عقوبت تک تمام امور کو سلکِ ضابطہ میں منسلک کر دیا ہے۔

ایک اور مقام پر لکھا ہے۔ ''قرآن کے بے شمار اوصاف میں سے دو زیادہ واضح ہیں۔ اول وہ ہیبت و احترام کا لہجہ جو اس خالق اکبر کے متعلق ہر جگہ اس میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جس کی طرف کوئی

انسانی کمزوری اور انسانی خواہش منسوب نہیں کی گئی۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ اس میں اول سے آخر تک غیر فصیح، مخربِ اخلاق اور نامناسب خیالات، محاورات اور حکایات کا نام و نشان تک نہیں پایا جاتا۔ جو تمام خرابیاں، افسوس ہے کہ اس کتاب میں بکثرت موجود ہیں جس کا نام پیروانِ مسیح نے ''عہد قدیم'' رکھا ہے۔''

عیسائیت اور اسلام کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ امر ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ عیسائی فطرۃً یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان پر عیسائیت کا اثر و گرفت اس کے اصولوں کی بنا پر ہے۔ اس طرح عیسائی مذہب اور اخلاقیات کو ایک دوسرے سے مختلف و متبائن قرار دیتے ہیں۔ مگر بخلاف اس کے اسلام نے اپنے اصولوں کے بل پر نہیں، بلکہ عملاً اپنے پیروؤں کے اخلاقی، اجتماعی، آئینی اور سیاسی خیالات و حالات پر اثر کیا ہے۔ اس لئے مسلمانوں کے نزدیک ایک لفظ ''اسلام'' حُبِ وطن، شریعت، روایت، آئینِ حکومت حق کے تمام معانی کو محیط ہے۔ قرآن کریم نے جس مذہب کی بنیاد ڈالی ہے۔ وہ زبردست اور مکمل وحدانیت ہے۔ اس میں ہر جگہ صاف طور پر الوہیت کا جلوہ نظر آتا ہے۔''

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''اس زمانہ کے عیب اور ان لوگوں کی کوئی بات میرے خیال میں نہیں آتی، جو کہتے ہیں کہ آنحضرت (صلعم) معاذ اللہ جعل ساز تھے اور انہوں نے قرآن ایسا لکھا ہے۔ یعنی انہوں نے قصداً فریب کیا ہے۔ جیسے کہ جعلساز لکھے۔ میری رائے میں جو منصف آدمی قرآن کو پڑھے گا۔ اس کا یقین اس قول سے بالکل مختلف ہوگا۔''

قرآن کا مخرج وہ ہستی ہے جس کی تھاہ کسی نے نہیں پائی

کارلائل ایک مشہور فاضل اور محقق گذرا ہے، وہ کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کا پروفیسر تھا۔ جمال الدین ابن تعزی بروی کی کتاب مورد الطاف کے ایک حصہ کا اس نے لاطینی میں ترجمہ کیا تھا۔ کارلائل اگرچہ مسیحیت کا حلقہ بگوش تھا لیکن قرآن کا جب اس نے مطالعہ کیا تو اسے مجبوراً یہ لکھنا پڑا کہ:

''جب تم ایک دفعہ قرآن کریم کو بغور پڑھ چکو تو اس کی خصوصیتیں منکشف ہونے لگتی ہیں۔ اس کتاب میں ایک خوبی ایسی ہے۔ جو ادبی خوبیوں سے بالکل مختلف ہے۔ اگر ایک کتاب کا مضمون مصنف نے دلی توجہ سے ادا کیا ہے تو اس کے الفاظ دوسرے لوگوں کے دلوں پر بھی اثر ڈالتے ہیں اور اس صفت

کے مقابلہ میں ہر قسم کی مہارت اور تجربہ کاری ہیچ ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کی پہلی خصوصیت اس کی اصلیت میں مضمر ہے۔ یعنی اس حقیقت میں کہ وہ حقیقی معنوں میں ایک کتاب ہے۔ میرے نزدیک قرآن میں خلوص اور سچائی کا وصف ہر پہلو سے موجود ہے اور یہ وہ خوبی ہے۔ جو کتاب میں جو فی الواقع کتاب کہلانے کی مستحق ہے۔ موجود ہونی چاہئے۔ دیگر اوصاف اس خوبی سے پیدا ہوتے ہیں' بلکہ سچ ہے کہ اگر کوئی خوبی پیدا ہو سکتی ہے تو اسی سے ہو سکتی ہے۔''

ایک اور مقام پر لکھتا ہے:

''جو سخت اور کرخت پیغام اس (پیغمبر اسلامؐ) نے دنیا کو دیا' بہرحال وہ ایک سچا اور حقیقی پیغام ہے اور اگرچہ وہ ایک غیر مرتب کلام تھا مگر اس کا مخرج وہی ہستی تھی۔ جس کی تھاہ کسی نے بھی نہیں پائی۔

''قوم عرب میں ایک اولوالعزم پیغمبر ایسے کلام (قرآن) کے ساتھ جس پر وہ یقین کرتے تھے۔ بھیجا گیا۔ ایک صدی کے اندر عرب کے ایک طرف غرناطہ اور دوسری طرف دہلی ہوگئی۔ گویا ایک چنگاری ایسے ملک میں پڑی جس کو اندھیرے میں کسمپرس ریگستان نے زور شور سے اڑ جانے والی بارود کی طرح نیلے آسمان پر اٹھتے ہوئے شعلوں سے دہلی سے غرناطہ تک روشن کر دیا۔''

کارلائل اپنی کتاب کی جلد ۶ صفحہ ۲۱۴ میں لکھتا ہے۔

''قرآن کے پڑھنے سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ وہ صادق کا کلام ہے اور صداقت سے مملو ہے۔''

قرآن نے دنیا کی کایا پلٹ دی

یہی مصنف اپنی گراں قدر تصنیف ''دی پاپولر ریلیجن آف دی ورلڈ'' The Popular Religion of the World میں لکھتا ہے:

''قرآن ایک آسان اور عام فہم مذہبی کتاب ہے۔ جس کی نسبت مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ یہ کتاب ایسی وقت میں دنیا کے سامنے آئی جب کہ طرح طرح کی گمراہیاں مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک پھیلی ہوئی تھیں۔ انسانیت و شرافت اور تہذیب و تمدن کا نام و نشان تک مٹ چکا تھا۔ ہر طرف بے چینی اور بدامنی نظر آتی تھی اور نفس پروری کی ظلمتوں کا طوفان امنڈ آیا تھا۔ قرآن نے اپنی تعلیمات سے امن و سکون اور محبت کے جذبات پیدا کئے۔ بے حیائی کی ظلمتیں کافور ہوگئیں اور ظلم و ستم کا بازار سرد ہو گیا۔ ہزاروں گم کردگانِ راہ راہ راست پر آ گئے اور بے شمار وحشی تہذیب کے پرستار

بن گئے۔ اس کتاب نے دنیا کی کایا پلٹ دی۔ جاہلوں کو عالم، ظالموں کو رحمدل اور عیش پرستوں کو پرہیز گار بنا دیا۔ یہی وہ کتاب ہے جو آج بھی چالیس کروڑ انسانوں کے دلوں پر حکومت کرتی ہے۔''

(صفحہ ۱۱۵)

قرآن کے کلام پر عقل حیرت زدہ ہے

کونٹ ہنری دی کاسٹری اپنی کتاب ''الاسلام'' میں جو کونٹ موصوف نے فرنچ میں لکھی اور جس کا ترجمہ مصر کے مشہور مصنف احمد فتحی بک زاغلول نے ۱۸۹۸ء میں شائع کیا۔ لکھتے ہیں:

''قرآن کی وحی کا مسئلہ اور بھی زیادہ مشکل اور پیچیدہ مسئلہ ہے کیونکہ اربابِ بحث اس کو معقول طور پر حل نہیں کر سکے۔ عقل بالکل حیرت زدہ ہے کہ اس قسم کا کلام اس شخص کی زبان سے کیونکر ادا ہوا جو بالکل امی تھا۔ تمام مشرق نے اقرار کیا ہے کہ یہ وہ کلام ہے کہ نوع انسان لفظاً اور معناً ہر لحاظ سے اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ یہ وہی کلام ہے جس کی بلند انشا پردازی نے عمر بن خطاب کو مطمئن کر دیا اور وہ خدا کے معترف ہو گئے۔ یہ وہی کلام ہے کہ جب یحییٰ کی ولادت کے متعلق اس کے جملے جعفر بن ابی طالب نے نجاشی کے سامنے پڑھے تو اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور بشپ چلا اٹھا کہ 'یہ کلام اسی سرچشمہ سے نکلا ہے جس سے عیسیٰ علیہ السلام کا کلام نکلا تھا'۔

''محمد ﷺ قرآن کو اپنی رسالت کی دلیل کے طور پر لائے اور وہ اس وقت سے تا ایں دم ایک ایسا مہتم بالشان راز چلا آتا ہے۔ جس کے طلسم کا توڑنا انسان کی طاقت میں نہیں ہے۔''

ایشیا اور شمالی افریقہ میں اسلام کے پھیلنے اور مختلف قوموں کو اپنا زیر بنانے کی ایک اور بھی وجہ ہے...... اسلام کا اصول یہ تھا کہ جو قوم اسلام قبول کر لیتی تھی۔ اس کے جان و مال ہر طرح محفوظ ہو جاتے تھے۔ لیکن جو قوم آبائی مذہب پر رہنے کو ترجیح دیتی تھی۔ اس پر ایک خفیف ٹیکس بنام جزیہ لگا کر اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا تھا جس کا مستحق عام مسلمانوں کو سمجھا جاتا تھا اور دین اسلام کے مبلغین ان سے کسی قسم کا تعرض نہیں کرتے تھے۔ یہ قرآن کریم کی تعلیم کا اثر تھا اور خلفائے راشدین کا اسی پر عمل رہا۔

''اسلام کے سائے میں عیسائی مطمئن ہو گئے۔ دعاتِ اسلام میں کوئی شخص ان کے مذہب سے متعارض نہیں ہوتا تھا اور اصل عیسائی اور مرتدوں میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ برتاؤ وہ

تھا جس کا خود قرآن نے حکم دیا تھا اور خلفائے اولین اس پر کاربند تھے۔''

قرآن کی نظیر سارے جہان میں نہیں مل سکتی

انگلستان کا نامور مورخ ڈاکٹر گبن اپنی مشہور تصنیف ''سلطنت روما کا انحطاط وزوال'' کی جلد۵ باب۵۰ میں لکھتا ہے:

''قرآن کی نسبت بحرِ اٹلانٹک سے لے کر دریائے گنگا تک نے مان لیا ہے کہ یہ دستور اساسی ہے۔ صرف اصولِ مذہب ہی کے لئے نہیں بلکہ دیوانی اور فوجداری نظام کے لئے بھی اور جن قوانین پر نظامِ عمران کا مدار ہے جن سے نوع انسان کی زندگی وابستہ ہے جن کی حیاتِ اجتماعی کی ترتیب وتنسیق سے تعلق ہے۔ ان کو خدا کی مرضی کے ماتحت نقائص وعیوب سے بالکل مبرا سمجھا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ محمدﷺ کی شریعت سب پر حاوی ہے۔ وہ اپنے تمام احکام میں بڑے سے بڑے شہنشاہ سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے فقیر و گداگر تک کے لئے مسائل ومبانی رکھتی ہے۔ یہ وہ شریعت ہے اور ایسے دانشمندانہ اصول اور اس قسم کے عظیم الشان قانونی انداز پر مرتب ہوئی ہے کہ سارے جہان میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔''

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

''تثلیث اور خدا کے مجسم ہونے کے رموز واسرار وحدۃ الوجود کے عقیدہ و اصول کی نفی و تکذیب کرتے ہیں۔ مذکورہ رموز واسرار سے صاف ظاہر ہے کہ وہ تین ہم مرتبہ خداؤں کی تعلیم دیتے ہیں اور (حضرت) مسیح کو جو ایک انسان ہیں۔ خدا کا بیٹا ظاہر کرتے ہیں۔ قدیم زمانے کی تفسیر صرف ایک راسخ العقیدہ عیسائی کو مطمئن کر سکتی ہے۔ (حضرت) محمدﷺ کا ایمان وعقیدہ ہر قسم کی پیچیدگی وابہام سے پاک وصاف ہے اور قرآن کریم خدا کی وحدانیت کی ایک زبردست شہادت ہے۔''

اپنی تالیف میں ایک اور جگہ رقم فرماتے ہیں:

''قرآن وحدانیتِ خدا کا ایک شاہدِ عظیم ہے۔ ایک فلسفی موحد بے تکلف مذہب اسلام میں شریک ہو سکتا ہے۔ ایک مذہب جو شاید ہم لوگوں کی موجودہ سمجھ کے لئے بہت عالی ہے۔''

گبن اپنی مشہور تاریخ ''ہسٹری آف دی ورلڈ'' میں لکھتا ہے:

''ہر انصاف پسند آدمی اس حقیقت کا اقرار کرنے کے لئے مجبور ہے کہ قرآن ایک بے نظیر قانونِ ہدایت ہے۔ اس کی تعلیمات انسانی فطرت کے مطابق ہیں اور وہ اپنے اثر کے لحاظ سے ایک حیرت انگیز پوزیشن رکھتا ہے۔ اس نے وحشی عربوں کی

زبردست اصلاح کی۔ ہمدردی اور محبت کے جذبات سے ان کے دلوں کو معمور کر دیا۔ اور قتل و خونریزی کو ممنوع قرار دیا۔ یہ اس کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔'' (صفحہ ۲۲۸)

قرآن ہی مسلمانوں کی ترقی کا ذریعہ تھا

ڈاکٹر ڈریپر اپنی مشہور تصنیف ''انٹلکچول ڈویلپ منٹ آف یورپ'' (یورپ کا ذہنی ارتقاء) کی جلد اول میں لکھتے ہیں:

یہ امر قابلِ غور ہے کہ عیسائیت کی عمر اس وقت جب کہ اسلام ہجرت سے تقریباً چھ سو برس کا عرصہ طے کر چکا تھا۔ تیرہ سو برس سے زیادہ تھی۔ لیکن اگر بلحاظ تہذیب وتمدن معاشرت وسیاست وغیرہ ہر دو مذاہب کا مقابلہ کیا جائے۔ تو لابدی اور یقینی نتیجہ ہے کہ عیسائیت مانع ترقی ہے۔

(عیسائی یورپ) کی اس جہالت اور وحشت پر غور کرو اور نیز ان واقعات کو تنقیدی نظر سے دیکھو جن کا تذکرہ ہم کریں گے اور اس کے مقابلہ میں اس علم وفضل اور تہذیب وتمدن کو اسلام کی سرپرستی اور حمایت میں ترقی کرتا ہوا دیکھو، جس سے دنیا بعثت سے پیشتر ناآشنا تھی۔ تو بلا شائبہ ریب دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ ترقی کا ذریعہ صرف اسلام ہے۔

اور اگر ان تاریخی واقعات کو بھی پیش نظر رکھا جائے جو مسلمانوں اور عیسائیوں کی موجودہ حالت کا باعث ہیں تو بلاریب تیسرا نتیجہ جو ہر دو دعاوی متذکرہ صدر کا ثبوت ہوسکتا ہے۔ یہ ہے کہ عیسائی دنیا کی ترقی کا آغاز اس وقت سے ہوا ہے جب سے تعلیم اسلام سے واقفیت پیدا کرنے کا موقع ملا اور اس لئے لوگ عیسائیت سے عملاً کنارہ کش ہوتے گئے اور مسلمانوں کا تنزل مقابلۃً اس وقت سے شروع ہوا۔ جب اسلام کے اصولوں پر ان کا عمل نہ رہا۔ یعنی جب تک عیسائی عیسائیت پر عامل رہے۔ وہ ترقی کے دشمن اور جاہل اور وحشی تھے۔ جب عیسائیت کو عملاً ترک کر دیا اور اسلامی اصولوں کے پابند ہوئے۔ ترقی کے میدان میں قدم رکھا۔ اس کے برخلاف جب مسلمانوں کا دستور العمل قرآن تھا۔ وہ روز افزوں ترقی کرتے چلے گئے۔ جب اس سے غافل ہو گئے۔ پستی کی طرف رجوع کیا۔''

ڈاکٹر موصوف اپنی کتاب کی جلد دوم کے باب دوم میں لکھتے ہیں کہ:

''جب پیغمبر اسلام ﷺ سے ان کی رسالت کے ثبوت میں معجزہ طلب کیا گیا تو آپ نے اپنے انداز خاص میں قرآن کی ترتیب کی طرف اشارہ کیا۔ جس کی خوبی کو کوئی چیز نہیں پہنچ سکتی اور جو اس کے الہامی ہونے کا بین ثبوت ہے۔''

قرآن کی تعلیم ہی اخلاقی قانون کا کام دے سکتی ہے

مسٹر مارماڈیوک پکتھال Mr. Marmaduke Pickthall نے ''اسلام اینڈ ماڈرنزم'' پر لندن میں تقریر کرتے ہوئے بیان کیا:

''وہ قوانین جو قرآن میں درج ہیں' اور جو پیغمبر اسلام ﷺ نے سکھائے ہیں۔ صرف وہی اخلاقی قوانین کا کام بھی دے سکتے ہیں۔ آپ اس سے کسی طرح انکار نہیں کر سکتے کہ یہی ایک قانون ہے جس پر ہر ملک وملت کے وہ باشندے عمل پیرا ہو سکتے ہیں جو انسانی بھلائی اور ترقی کے ذریعہ خدا کا قرب حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ صرف اسی مذہب کے دونوں رکن یعنی حقوق اللہ وحقوق العباد کو کامل طور پر مواصلت دی گئی ہے۔ اس بات کا اقرار نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ ان عیسائیوں اور یہودیوں نے بھی کیا ہے۔ جنہوں نے اس کا مطالعہ کیا ہے۔

گذشتہ چند سالوں میں مسلمان اس قانون کے لفظوں کی اینچ کرتے رہے ہیں اور انہوں نے اصلی مدعا کو خبط کر دیا ہے۔ کسی شیخ الاسلام یا مجتہد کے فتویٰ کی اندھی تقلید کرنا یا کسی قانون کے معمولی سے اختلاف یا اجتہاد میں مبالغہ کرنا۔ الغرض اس قسم کی تمام کاہلیت کو قرآن نے بہت مذموم قرار دیا ہے۔''

مسٹر موصوف نے مسلمانانِ لندن کے روبرو ''خدا کی بادشاہی'' پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

''قرآن کے جس اعجاز کو خود محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے اکثر اپنے الٰہی مقصد کے ثبوت کے طور پر پیش کیا۔ حقیقت میں ایک معجزہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ محمد ﷺ اگرچہ تہذیب یافتہ تھے۔ مگر امی تھے اور اس امر میں شک کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے کہ اس عجیب وغریب فصاحت کا ایک بڑا حصہ آنحضرت ﷺ کے عالمِ بیہوشی میں نازل ہوا......اس کتاب کی سی کوئی اور کتاب صفحۂ عالم پر موجود نہیں ہے۔ یہ کتاب فی الواقع عجوبۂ روزگار ہے۔''

قرآن ایک بین معجزہ ہے

الکس لوازون ایک مشہور فرانسیسی فلاسفر اپنے ایک لیکچر میں فرماتے ہیں:

''قرآن جس کو خدا نے محمد ﷺ کے دل پر انسانوں کی راہنمائی کے لئے نازل کیا۔ بے شک ایک روشن اور پرحکمت کتاب ہے۔ اس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ وہ سچا نبی' صدیق اور اس خدا کا جو ہر ایک کام کو پورا کرنے کی طاقت رکھتا ہے' فرستادہ تھا۔ بلکہ وہ ایک ایسا عظیم الشان اور جلیل القدر نبی تھا جس نے بارادۂ الٰہی اسلام جیسے عالمگیر مذہب کی بنیاد رکھی اور اسے کتم عدم سے عالم

وجود میں لانے کی توفیق پائی۔ اس کے پیروؤں کی تعداد تیس کروڑ (بلکہ چالیس کروڑ) سے بڑھ گئی۔ جنہوں نے سلطنت روما کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال کر دیا اور اربابِ ضلالت کی جڑوں کو اپنے فتحمند نیزوں کی نوکوں سے کاٹ ڈالا۔ یہاں تک کہ ان کے ذکر سے مشرق و مغرب کی مقتدر طاقتیں کانپ اٹھیں۔''

یہی محقق اپنی کتاب ''لائف آف محمد'' میں لکھتا ہے:

''محمد ﷺ نے باوجودیکہ وہ امی تھا اور لکھ پڑھ نہ سکتا تھا۔ ایک ہی وقت میں تین عظیم مقاصد یعنی قومیت' دیانت اور شہنشاہیت[1] کی بنیاد ڈالی۔ اس کے علاوہ ایک ایسی کتاب دنیا کے سامنے پیش کی جو بلاغت کا ایک زبردست نشان' شریعت کا واجب العمل دستور اور دین وعبادات کا قابل اذعان فرمان ہے یہ وہ مقدس کتاب ہے جو اس وقت تمام دنیا کے ۱/۶ حصہ میں معتبر اور مسلم سمجھی جاتی ہے۔ اس کی انشا و حکمت کو ایک بین معجزہ مانا جاتا ہے اور خود اس کے مخاطب نے بھی اسے بطور اعجاز پیش کیا ہے۔''

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

''جدید علمی اکتشافات میں یا ان مسائل میں جن کو ہم نے اپنے علم کے زور سے حل کیا ہے۔ یا ہنوز وہ زیر تحقیق و نظر ہیں۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو تعلیمات قرآنی کے مخالف ہو۔ ہم عیسائیوں نے عیسائیت کو علم و سائنس کے ہم آہنگ و ہم نشیں بنانے میں اب تک جتنی کوششیں کی ہیں اسلام و قرآن میں یہ سب کچھ پہلے ہی موجود ہے اور پوری طرح سے موجود ہے۔''

قرآن میں تمام آداب واصول حکمتِ وفلسفہ موجود ہیں

موسیو سیدیو جو فرانس کا ایک مشہور و معروف مستشرق ہے۔ خلاصہ تاریخ العرب (صفحات ۵۹' ۶۳' ۶۴) میں لکھتا ہے:

''قرآن ایک واجب التعظیم کتاب ہے۔ جس نے بتایا ہے کہ خدا کے حقوق بندوں پر کیا ہیں اور بندوں کے حقوق اور تعلقات خدا سے کس قسم کے ہونے چاہئیں۔ اس میں فلسفہ اور اخلاق کی ہر قسم کی باتیں مذکور ہیں۔ فضل وکمال' عیب ونقصان' حقیقت' اشیا' عبادت و اطاعت' گناہ و معصیت۔ غرضیکہ کوئی بات ایسی نہیں جس کا جامع قرآن نہ ہو۔ واقعات کے اعتبار سے اس کی آیتیں رسول اللہ ﷺ پر اترتی رہیں اور یہی ایک چیز تھی جس نے سارے عرب میں قومیت پیدا کی۔ جنگجو قبائل میں اتحاد و اتفاق کی بنیاد ڈالی اور دنیا میں ایک عالمگیر رابطہ پیدا کیا۔

''وہ آداب و اصول جو فلسفہ وحکمت پر قائم ہیں۔ جن کی بنیاد عدل وانصاف پر ہے۔ جو دنیا کو بھلائی اور احسان کی تعلیم دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک جزئیہ بھی ایسا نہیں جو قرآن میں نہ ہو۔ وہ اعتدال و

[1] یہ بات درست نہیں ہے۔ اسلام قومی دین نہیں بلکہ عالمی اور آفاقی دین ہے۔ نیز شہنشاہیت اور خلافت علیٰ منہاجِ نبوت میں جو فرق ہے وہ قارئینِ طلوع اسلام پر بخوبی واضح ہے۔

میانہ روی کا سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔ گمراہی سے بچاتا ہے۔ اخلاقی کمزوریوں کی تاریکی سے باہر نکال کر فضائل کی روشنی میں لاتا ہے اور انسانی زندگی کے نقائص کو کمالات سے بدل دیتا ہے.....

اسلام کو جو لوگ وحشیانہ مذہب کہتے ہیں۔ ان کے تاریک ضمیر ہونے کی بڑی دلیل یہ ہے کہ قرآن کی ان صریح آیتوں کو بالکل نہیں دیکھتے جن کے اثر سے عرب کی تمام بری اور معیوب عادتیں جو مدتہائے دراز سے سارے ملک مین رائج تھیں' مٹ گئیں مثلاً بدلہ لینا' خاندانی عداوت کی پابندی و کینہ پروری' جور و تعدی کا اظہار جس کا رواج پہلے بھی یورپ میں تھا اور اب بھی ہے۔ جو ڈوئل کی صورت اختیار کئے ہوئے ہے۔ دختر کشی وغیرہ وغیرہ یہ ساری مذموم رسوم قرآن نے مٹا دیں۔''

قرآن قطعی طور پر ایک عملی مذہب پیش کرتا ہے

ڈڈلی رائٹ ایک مشہور مسیحی مصنف کہتا ہے:

''حضرت محمد ﷺ کے عہد میں ایک فرقہ حضرت مریم کی پرستش بطور خدا کے کرتا تھا۔ دوسرا اپنی قائم کردہ تثلیث میں انہیں عزت کی جگہ دیتا تھا۔ ایک اور فرقہ کے نزدیک یسوع مسیح خدا کا بیٹا نہیں۔ بلکہ خدا تھا۔ جو انسانی شکل میں ظہور پذیر ہوا تھا کئی اور فرقے بھی تھے ایک فرقہ باوجود عیسائی ہونے کے اور حضرت عیسیٰ کو محض ایک انسان سمجھنے کے یہودی قانون کا معترف اور یہودی رسوم کا پابند تھا۔

اس ابتری و انتشار کی حالت میں حضرت محمد ﷺ کے ذریعہ خدا کا کلام نازل ہوا۔ جس نے انسان کو خدا کی کامل اطاعت سکھائی۔ رسول اللہ ﷺ کا مقصد اس بت پرستی کو مٹا کر جو قوموں میں رائج تھی لوگوں کو خدا کی صحیح پرستش کی طرف مائل کرنا' توحید کامل کا پھیلانا اور کفار کو نورِ حق سے آگاہ کرنا تھا۔

ایک قادر مطلق خدا کا یقین' دین اسلام کا ایک اہم ترین ابتدائی اصول ہے۔ ایسا خدا تمام دیوتاؤں اور بتوں سے بالاتر ہے۔ رب العلمین ہے اور اس نے کسی کو جنا ہے نہ اس سے کوئی پیدا ہوا ہے اور نہ اس کا کوئی شریک ہے۔ خدا کی وحدانیت ایک ایسا مسئلہ ہے جس کو قرآن اور علم بردارانِ قرآن خاص اہمیت دیتے ہیں۔

اسلام میں یقین اور عقیدہ کے لفظ علم و عمل دونوں کو حاوی ہیں۔ اسلامی عقائد محض رٹ لینے کے لئے نہیں بلکہ انسانی زندگی کے روحانی و اخلاقی دونوں پہلوؤں کا دارومدار انہی عقائد پر ہے۔

اسلام قطعی طور پر ایک عملی مذہب ہے' جو باوجود اپنی پابندی اور سختی کے تمام ازمنہ اور تمام اقوام کی ضروریات سے مطابقت رکھتا ہے اور انسان کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ ان فرائض کو بوجہ احسن ادا کرے' جو خدا اور خدا کی مخلوق کے متعلق اس کے ذمے ہیں۔